ہماری ویب ڈیجیٹل بک

اویس شیرازی

OWAIS SHERAZI

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

SOCIETY & CULTURE

HAMARI WEB .com

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Owais Sherazi"
at Hamariweb.com

میں بڑا آدمی بنوں گا

ہماری سوسائٹی میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو والدین اپنے بچوں کیلئے بڑی عجیب سی پلاننگ سوچتے ہیں اور جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو ان کی سوچ بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ میں اپنے بچے کو بڑا آدمی بناؤں گا میں اپنے بچے کو ڈاکٹر بناؤں گا۔ میں اپنے بچے کو انجینیر بناؤں گا۔ میں تو اپنے بچے کو فوج میں بھیج دوں گا۔ بچہ سوچتا ہے میں تو پائلٹ بنوں گا وغیرہ وغیرہ۔ پھر ہوتا کیا ہے اکثر تو وہ بن ہی نہیں پاتے جس کا خواب انہوں نے دیکھا تھا اور کچھ وہاں پہنچ بھی جاتے ہیں جو انہوں نے سوچا تھا لیکن پھر ہوتا کیا ہے بڑھاپا اور پھر آخر کار موت سب ختم کر دیتی ہے۔ سمجھ تو یہی آتی ہے یہ بننا بننا نہیں ہے بس کچھ دیر کیلئے بن کر مٹنا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو اولیاء اللہ جلا جلالہ کہلاتے ہیں۔ جن کے واسطے دے دے کر ہم دعائیں کرتے ہیں۔ جن کے ذکر اور ناموں سے ہم سرور پاتے ہیں۔ ان کا معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ ان کے والدین اور یہ بھی بڑے ہو کر، زندگیوں کے بارے میں منصوبہ سازی کرتے ہیں، محنت کرتے ہیں اور بنتے ہیں۔ وہ ایسے بنتے ہیں کہ دنیا سے جا کر بھی مٹتے ہی نہیں ہیں اور کبھی مٹیں گے بھی نہیں۔ تاریخ سے یہی پتہ چل رہا ہے۔ حضرت خواجہ اجمیری، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی، حضرت امام حنبل، سلطان اولیاء المروف حضرت غوث پاک، حضرت داتا گنج

بخش علی ہجویری، حضرت خواجہ اجمیری اور حضرت بہاوالدین ذکریا ملتانی، حضرت عبداللہ شاہ غازی رحمت اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور بہت سے اولیاء ہیں انہوں نے جو مقام پائے ان میں کئی سو سال گزرنے کے بعد بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ بھی اسی دنیا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بھی وہی دنیا پائی جو ڈاکٹروں، انجینیروں، سرمایہ کاروں نے پائی۔ انہوں نے بھی روزگار کیلیے محنت کی۔ بلکہ ان کا چلن تو ایسا رہا کہ کسی سے کچھ مانگنا کبھی مناسب ہی نہیں سمجھا۔ لیکن ان کے بننے میں اور ہمارے معاشرے کے دوسروں کے بننے میں کتنا فرق تھے۔ اتنا وقت گزر گیا لیکن ان کا مقام آج بھی روشن ہے لیکن ان کے دور کے بادشاہوں، بڑے بڑے سرمایہ داروں اور دوسروں کا نام کوئی مقام کہیں نظر نہیں آتا۔ ایک دنیا ہے جو ان پر رحمتوں کی دعا کرتی ہے۔ جنہوں نے ان کو دیکھا بھی نہیں ان کے واسطے دے دے کر دعا کرتے ہیں۔ ہر انسان اپنی سمجھ کے مطابق ان کے تعظیم کرتا ہے۔ کیا مقام ہے، کیسی بادشاہی ہے۔ سالہا سال گزر گئے ان کے چرچے ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے۔

کوئی فرق ہے ان کے اور ہمارے بیچ۔ لیکن کہاں پر۔ شاید ان کے والدین کی سوچ سے فرق شروع ہوا ہے۔ شاید ان کے والدین نے نکاح کے بندھن میں بندھتے وقت یہ سوچ لیا تھا ہم نے اپنا کردار اسلامی رکھنا ہے اور پھر ان کی دعاؤں میں یہ دعائیں بھی شامل ہو گئیں تھیں کہ ان کی اولاد نیک ہو۔ لگتا ہے کہ ان کے

والدین نے ان کی پیدائش پر باقاعدہ کمر باندھ لی ہوگی کہ ہم اپنے بچے کو ایک اچھا مسلمان بنائیں گے اور ایک ایسا مسلمان جو دنیاوی علوم و فنون کو ایک مسلمان کی طرح سیکھے گا اور اس پر عمل بھی ایک مسلمان کی طرح کرے گا۔ مجھے لگتا ہے انہوں نے سب سے پہلے اپنے بچے کا اسلامی نام ڈھونڈ اور رکھا ہوگا۔ جب یہ بچہ بڑا ہوا ہوگا تو انہوں نے اپنے بچے کو ضرور اسلام کے بارے میں بتانا شروع کر دیا ہوگا۔ تھوڑا اور بڑا ہوا ہوگا تو اسے قرآن پاک پڑھانا شروع کر دیا ہوگا۔ ساتھ ساتھ کھانا کھانے، پانی پینے کا سنت طریقہ سکھایا ہوگا۔ کچھ عرصے بعد نماز سکھا دی ہوگی۔ پھر اپنے بچے کو بٹھا کر بتایا ہوگا۔ بیٹا ہمیں ہمارے رب جلاجلالہ نے اپنی عبادت کیلیے پیدا کیا ہے لہٰذا ہماری زندگی کا مقصد اپنے رب جلاجلالہ کی عبادت، رب جلاجلالہ کے حبیب پاک، سردار مکہ مکرمہ، سلطان مدینہ منورہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق کرنی ہے اور سلطان مدینہ منورہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے محبوب ہیں، ہم ان سے اپنے ہر رشتے اور ہر شے سے زیادہ بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتے ہیں۔ بچے نے مسکرا کر ایک عزم سے سر ہلایا ہوگا۔ یہ سب تو اسے پہلے ہی بتا اور سکھا دیا گیا تھا۔ پھر ایک دن بچے کو اس وقت کے سکول کے بارے میں بتایا ہوگا۔ اسے سمجھایا گیا ہوگا کہ اسے تعلیم بھی حاصل کرنی ہے اور آگے چل کر زندگی میں رزق حلال کمانے کے طریقے بھی طریقے بھی سیکھنے ہیں لیکن صرف ایک انسان کی حیثیت سے نہیں ایک مسلمان کی حیثیت سے اور یہ سب

ہمارا مقصد نہیں۔ ہمارا مقصد تو اپنے رب جلاجلالہ کو، رب جلاجلالہ کے حبیب پاک، سردار مکہ مکرمہ، سلطان مدینہ منورہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق راضی کرنا ہے۔ اس بچے نے اپنے ذہن میں سوچا ہوگا تو اس کے ذہن میں زندگی کا یہی مقصد آیا ہوگا۔ یہ وہی مقصد ہے جو شب و روز کی محنت سے اسے سکھایا گیا تھا۔ بس جب اس کی سوچ اپنے والدین کی سوچ سے مل گئی ہوگی، اسی لمحے ایک وہ بچہ آنے والے کل کے ایک ایسے انسان کی چلتی پھرتی تصویر میں بدل گیا ہوگا جو ایک کامیاب مسلمان بنے گا اور ایسا مقام پائے گا جس میں اس کے دنیا سے جانے کے بعد بھی کمی نہیں آئے گی۔

واہ کتنا فرق ہے اپنے آپ کو صرف مسلمان کہنے والوں اور اپنے آپ کو مسلمان بنانے والوں میں۔

بچوں کے حقوق

اسلام ایک ایسا خوبصورت دین ہے جس سے خوبصورت دین کہیں بھی نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہ صرف ایک جذباتی بات نہیں، ایک حقیقت ہے۔ اسلام ہے کیا۔ اسلام دین فطرت ہے۔ ایک انسان کیلئے جو سب سے بہتر ہے وہی اسلام ہے۔ زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں جیسی راہنمائی اسلام میں ملتی ہے دنیا کے کسی مذہب میں موجود ہی نہیں ہے۔ کیسے سونا ہے، کیسے کھانا ہے، کیسے پینا ہے، کیسے چلنا ہے، کیسے کھانسنا ہے، غسل کیسے کرنا ہے، ٹائلٹ میں کیسے جانا ہے اور جا کر رفع حاجت کیسے کرنی ہے، بال کیسے رکھنے ہیں، شادی کب کرنی ہے۔ غرضیکہ ہر انسانی ضرورت کے بارے میں واضح ہدایت موجود ہے۔ انسانی زندگی میں جو نئی چیزیں آ رہی ہیں اسلامی احکامات کا علم رکھنے والے ان کے بارے میں ہدایات اسلام ہی سے پاتے ہیں۔ جس طرح انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک ہر بات کی ہر مسئلے کی راہنمائی موجود ہے اسی طرح والدین اور بچوں کے بارے میں بھی واضح ہدایات موجود ہیں۔ لیکن عجیب سی بات ہے عام طور پر تذکرہ یا تاکید صرف والین کے بارے میں ہوتی ہے۔

بچوں کا مقام تو ایک بیکار سی شے کی مانند ہے۔ جب چاہا مار لیا۔ جب چاہا ڈانٹ دیا۔ جب چاہا ڈرا دیا۔ جب چاہا جو مرضی کروا لیا۔ بچے پر والدین کے

حقوق شروع ہونے سے بہت پہلے ہی بچوں کے حقوق والدین پر شروع ہو جاتے ہیں۔
لیکن ہمارے معاشرے میں یوں لگتا ہے کہ جیسے بچوں کے حقوق کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ابھی لڑکی اور لڑکے کی شادی بھی نہیں ہوئی ہوتی۔ ابھی صرف یہ سوچا جا رہا ہوتا ہے کہ شادی کس سے کی جائے تو اسی وقت سے مستقبل میں ہونے والی اولاد جس کی روح ابھی دنیا میں آئی ہی نہیں اس کا حق اس کے ہونے والے باپ پر نافذ ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکا جو کل کا باپ ہے شادی کیلئے نیک اور صالح لڑکی کا انتخاب کرے اور اس پر لازم ہے کہ لڑکی کا انتخاب اسلامی ہدایات کے مطابق کرے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ کل قیامت کے دن اس کے بچے اس کی شکایت کریں کہ ہمارے باپ نے ایسی عورت سے شادی کی جو دیندار نہ تھی اور ہماری ماں نے ہماری اسلامی تعلیم وتربیت نہ کی۔ ہم گناہ کرتے رہے لہٰذا آج ہمارے باپ کو بھی ہمارے ساتھ جہنم میں بھیجا جائے۔ ان لوگوں کیلئے غور کا مقام ہے جنہیں اولاد کے حقوق کا کبھی احساس نہیں ہوتا۔

اور جب کوئی شادی کیلئے اسلامی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے نیک اور صالح لڑکی کا انتخاب کرتا ہے تو درحقیقت دنیا، قبر اور قبر کے بعد کی آنے والی زندگی کی بیشمار خوشیوں کا دروازہ نہ صرف اس پر بلکہ اس کے تمام کنبے پر کھل جاتا ھے۔ اسلامی ہدایات کی روشنی میں ایک نیک لڑکی اس کی بیوی بنتی ہے تو یہی نیک لڑکی اس کے بچوں کی ماں بنتی ہے اور یہ ماں اپنے خاوند کے شانہ بشانہ

بچوں کی تربیت کرتی ہے تو یہ بچے انڈین گانوں پر رقص کرنے کی بجائے تلاوت اور نعت سن کر جھومتے ہیں۔ ہمارے ہاں جب عام طور پر بچے بڑے ہوتے ہیں تو اکثریت کو دین چھ کلمے پڑھنے، بچپن میں ایک دفعہ قرآن پڑھنے، چند سورتیں پڑھنے اور بڑے ہو کر جمعہ اور عید کی نماز پڑھنے تک محدود ہوتا ہے۔ کچھ اس سے بہتر بھی ہوتے ہیں وہ نماز روزے کے پابند ہوتے ہیں اور اس سے آگے کی سمجھ تو خوش نصیبوں کو ہوتی ہے جن کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن کچھ بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے دین کی آخری حد ان کی نماز نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی نماز تو ایک ایسا ستون ہوتی ہے جس پر وہ تمام عمر ایک مسحور کن دینی عمارت بناتے ہی جاتے ہیں اور پھر اس وقت جب اکثر والدین اپنی اولاد کی بدولت طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی نافرمانیوں کا رونا رو رہے ہوتے ہیں۔ اپنے ہی لگائے ہوئے پودے کا کڑوا پھل کھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ والدین جنہوں نے شادی کے وقت اسلامی اصولوں کو مدِّ نظر رکھا تھا یہ اپنے بچوں کی فرمانبرداری کا لطف اٹھاتے ہیں۔ جب یہ والدین دنیا سے چلے جاتے ہیں تو ان کی اولاد دین سے بیگانے والدین کی اولاد کی طرح گناہِ جاریہ نہیں بلکہ صدقہ جاریہ بنتی ہے۔ اچھی اولاد کے اچھے چال چلن کی بدولت قبر اور محشر میں رحمت ان کا نصیب بنتی ہے۔ ایک خوبصورت نظام ہے۔ والدین بچوں کی اسلامی تربیت کرتے ہیں اور ان کا بچہ ایک اچھا مسلمان بن کر اپنے والدین کی خدمت بھی کرتا ہے اور ایک مفید شہری بھی بنتا ہے۔ ذرا ماضی پر نظر دوڑائیں۔

والدین نیک تھے تو بچے بھی ان کی تصویر بنے اور جب ان بچوں نے معاشرے میں باگ دوڑ سنبھالی تو مسلمانوں کے عروج کی کہانیاں تاریخ کا حصہ بن گئیں لیکن آج کے والدین بدل گئے ہیں بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ آج ہمارے اکثر مسائل ایسے ہی والدین کی مرہون منت ہیں۔ خود بھی دین سے بیگانے اور ان کے زیر سایہ پروان چڑھنے والی اولاد بھی ان کی تصویر۔ صرف یہاں تک نہیں بلکہ ایسی مثالیں موجود ھیں کہ بچے نے کسی اچھے کی وجہ سے اچھے اعمال کرنے کی کوشش کی تو گھر والوں نے بچے کی سخت مخالفت کی۔ فرمایا کہ ابھی تم جوان ہو، یہ کام بڑھاپے میں کرنے کے ہیں۔ اکثر والدین کا کردار بچوں کے حوالے سے صرف اتنا ہے کہ کھانے پینے اور پہننے کو دے دیا۔ جب چاہا مار لیا۔ بچے بڑے ہوئے تو شادی کر دی۔ بچے کس نے کس لئے دیے ہیں۔ اولین مقصد کیا ہے۔ یہ ذہنوں سے نکل چکا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آجکل اکثر لوگ ایسے ہیں جو بچوں کی نامناسب حرکتوں سے پریشان رہتے ہیں۔ شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنی ساری زندگی کے اہم فیصلوں میں باقی سب کام کرتے ہیں لیکن تمام زندگی ایک فرض کی طرح اسلام سے فاصلہ قائم رکھتے ہیں۔ اپنے بچوں کو بڑی بڑی ڈگریاں تو لے دے دیتے ہیں لیکن اسلامی احکام نہیں سکھاتے۔ جب ایسے لوگوں کو اولاد کے برے کردار کی وجہ سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے ہی لگائے ہوئے پودے کا کڑوا پھل

کھانا پڑتا ہے تو اولاد کا کوستے وقت انہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کیا انہوں نے اپنی اولاد کو ان کا پہلا حق دیا تھا۔ کیا بچپن میں ان کی اسلامی تربیت کا اہتمام کیا تھا اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اس روایت کو یاد رکھیں کہ جس نے اپنی اولاد کی دینی تربیت نہیں کی اس کا اپنی اولاد سے فرمانبرداری کی امید رکھنا حماقت ہے۔

ہم کیا کھا رہے ہیں

آپ نے بہت سارے مریض دیکھے ہوں گے اور جا بجا کھانے پینے کی دوکانیں بھی دیکھی ہوں گی۔ کوئی اگر آپ سے کہے کہ جناب ان مریضوں اور ان دوکانوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے تو شاید آپ اس پر یقین نہیں کریں گے۔ لیکن یہ بات کافی حد تک صحیح ہے اور اس پر اگر میں یہ کہوں کہ یہ امراض اسلام کے عطا کردہ صفائی کے نظام سے روگردانی کی سزا ہے تو شاید کچھ لوگ مسکرائیں اور میری بات بھی نہ سنیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ اسلام کی بات تو کسی بچے کے پیدا ہونے پر یا کسے کے مرنے پر، یا نکاح کے وقت ان چند منٹوں پر ہوتی ہے جب نکاح خواں نکاح پڑھاتا ہے یا چند اور موقعوں پر۔ لیکن حقیقت حقیقت ہوتی ہے۔

اسلامی طریقہ ہے کہ کھانے سے پہلے ہاتھ دھو لئے جائیں اور دھونے کے بعد کسی چیز سے صاف نہ کئے جائیں۔ اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ لیکن ہم نے یہ اصول چھوڑ دیا اور نتیجۃً بہت سے جراثیم کھانے کے ساتھ ہاتھوں کے ذریعے ہمارے اندر چلے جاتے ہیں۔

باہر کے کھانوں میں سب سے زیادہ برگر کی دوکانیں ہیں۔ ان دوکانوں میں شاید

کوئی ایسی دوکان بھی ہو جو واقع میں صرف برگر کی دوکان ہو۔ یہ مفت بیماریوں کی دوکانیں ہیں جو برگر کے ساتھ ملتی ہیں۔ ذرا سوچئے کی اگر کوئی برگر والا برگر والی پلیٹ میں مرغی کی بیٹھ (مرغی کا پخانہ) بھی رکھ کر دے تو کیا کوئی کھائے گا۔ نہیں نہ۔ لیکن لوگ کھا رہے ہیں۔۔ برگر میں جو انڈے استعمال کئے جاتے ہیں ذرا ان کو دیکھیں ان پر مرغی کی بیٹھ (مرغی کا پخانہ) لگی ہوتی ہے۔ انڈے دھونے کا رواج ہی نہیں ہے نہ برگر کی دوکان پر نہ ہمارے گھروں میں۔۔ برگر والا توے پر گھی ڈالتا ہے۔ انڈا پکڑتا ہے اس کے ہاتھ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اور پھر انہیں ہاتھوں سے گاہگ کو برگر بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ میں نے کافی دوستوں کو بتایا لیکن کسی کو کہیں بھی دھلے ھوئے انڈے نظر نہیں آئے۔ ایک دوست نے تو ایک مفتی صاحب سے رابطہ کرنے کے بعد مجھ سے اتفاق کیا۔ برگر والے کو اگر ذرا سی اسلامی سوچ ہوتی تو وہ انڈے دھو کر استعمال کر لیتا۔ لیکن افسوس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کباب سموسے بھی بہت کھائے جاتے ہیں۔ کباب سموسے والے عموماً قیمہ دھوتے نہیں ہیں۔ ان کے بقول دھونے سے کباب سموسے کا ذائقہ متاثر ہوتا ہے۔ اکثر ہوٹلوں پر کھانے کے برتن دھونے کا سسٹم کچھ یوں ہوتا ہے کہ دھلنے والے برتن ایک بڑے سے پانی سے بھرے ٹب وغیرہ میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ پانی دھلنے والے برتنوں کی وجہ سے آلودہ ہو جاتا ہے اور پھر اسی گندے پانی سے برتن نکال کر

کپڑے سے صاف کرکے دوبارہ کاگوں کے سامنے پیش کر دیئے جاتے ہیں۔ اب خود ہی سوچیں کہ ان برتنوں میں کھا کر ہم بیمار نہیں ہوں گے تو اور کیا ہو گا۔

پان بھی بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ اور کچھ یا اکثر لوگ مٹی میں چمڑا رنگنے والا رنگ ملا کر فروخت کرتے ہیں اور پان چھالیا، گٹکا، سونف سپاری، رنگ برنگی میٹھی گولیوں پر کپڑے رنگنے والا رنگ ملا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ کھانے کا گلابی رنگ بہت مہنگا ہوتا ہے۔ اب پان کھانے والے کو السر ہو یا کینسر اس پر کیا کہا جا سکتا ہے۔

مجھے میرے ایک دوکان دار دوست نے بتایا کہ مٹھائی والے رسگلوں میں سرف ملاتے ہیں۔ میں نے ایک مٹھائی والے سے تصدیق چاہی تو اس نے بتایا کہ سرف کے بغیر چمک اور صفائی نہیں آتی۔ اور جو مرغیاں اور جانور مر جاتے ہیں ان کو سستے داموں خرید کر انہیں مرے ہوئے جانوروں کا گوشت بیچنا تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

یہ چند مثالیں پیش کی ہیں ورنہ اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ بازاری کھانوں سے حتی الامکان بچا جائے اور کھانا گھر سے ہی کھایا جائے۔

ہمیں سونے دو

مسائل کی نہ رکنے والی موسلا دھار بارش سے مسائل کا سیلاب کب کا آ چکا ہے۔ عوام اس سیلاب میں ڈبکیاں کھا رہے ہیں لیکن بارش ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی اور اس بارش کا شکار عوام کا کہنا ہے کہ اس سیلاب اور بارش کا، سارے مسائل کا سبب سیاستدان اور جرنیل ہیں۔ عوام کی یہ سوچ ایک مضحکہ خیز فریب ہے جو کئی سالوں سے عوام اپنے آپ کو دیتی چلی آ رہی ہے۔

ہمارے ملک میں سیاستدانوں کی تعداد چند ہزار ہے اور عوام کی تعداد کروڑوں میں اور یہ کروڑوں کی عوام وہ عوام ہے جو سنہ 1947 میں اسلام کے نام پر حرکت میں آئی اور دنیا کا پہلا اسلامی نظریاتی ملک وجود میں آ گیا۔ یہ عوام بہت تھک گئی تھی لہٰذا جب ملک مل گیا تو غفلت کی نیند سو گئی۔ سنہ 1965 میں اور چیف جسٹس کو بحال کروانے کیلئے کچھ دیر کیلئے جاگی اور پھر سو گئی اور ایسی گہری نیند سو گئی کہ آج تک گہری نیند سو رہی ہے۔ ایک وقت تھا جب اس خطے کی مسلمان عوام ایک علیحدہ اسلامی نظریاتی ملک کیلئے چیخ رہی تھی اور آج 63 برس گزر گئے یہ ملک مسائل کی یلغار میں گھرا اپنی عوام کیلئے چیخ رہا ہے لیکن کوئی اس کی آواز نہیں سنتا۔ ہسپتال میں جب کسی شخص کا آپریشن ہونا ہو

تو اسے بیہوش کرنے کیلئے انجکشن دیا جاتا ہے۔ اس انجکشن سے مریض کو نشہ ہو جاتا ہے وہ سو جاتا ہے۔ یہ انجکشن دینے والا ایک ڈاکٹر ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان کی عوام کو نشے کی نیند سونے کیلئے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر کوئی اپنا ڈاکٹر خود ہے۔ اپنی حیثیت اور مقام کے مطابق ہر کوئی نشہ کرنے کرنے کیلئے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے اور طریقے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بس نشئیوں کو نشہ ملنا چاہئے۔ اور اگر ہر وقت نشے میں دھت رہنے والے اپنے گھر کے دروازے پر بورڈ لگا دیں کہ ہم نشے میں ہیں سو رہے ہیں۔ چوری اور لوٹ مار کرنے کی کھلی اجازت ہے بس ہماری نیند نہیں کھلنی چاہئے۔ تو اب کوئی فراڈ کرے، چوری کرے۔ قبضے کرے۔ عوام کی دولت لوٹ لے اس پر احتجاج کیسا۔

جناح صاحب کو زہر دے دیا گیا۔ لیاقت علی خاں کو گولی مار دی گئی۔ پاکستان کے دو ٹکڑے کر دئے گئے لیکن ہم سوتے رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک سنہری موقع کا نام تھا۔ اس سنہری موقعے کو، بھٹو کو چھین لیا گیا لیکن عوام سوتے رہے۔ بھٹو کو اس ملک سے اور اس ملک کے عوام سے محبت کی سزا دے دی گئی لیکن پھر بھی عوام سوتے رہے۔ عوام کے نام پر ملک پر قرضوں کا بوجھ بڑھتا رہا عوام سوتے رہے۔ سونے جیسے ملک کو بھکاری بنا دیا گیا۔ زرعی ملک سے آٹا، چینی غائب کر دی گئی۔ عوام پر ٹیکسوں کی بارش کر دی گئی لیکن عوام سو رہی ہے۔ ہمارا نشہ ٹوٹتا ہی نہیں۔

میرے پیارے قارئین معاف کیجئے گا۔ میرا نشہ ٹوٹ گیا تھا اسلئے میں کچھ غلط لکھ گیا ہوں۔

آیئے میں آپ کو نشے میں رہنے کے کچھ طریقے بتا دوں جو ہمارے معاشرے میں رائج ہیں اور آزمودہ ہیں۔ سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ آپ جب تک اپنے ضمیر کو سلانے میں کامیاب نہیں ہوں گے آپ کو کبھی بھی نیند نہیں آئے گی اور آپ سو کر بھی جاگتے رہیں گے اور اگر آپ نے اپنے ضمیر کو سلا لیا تو پھر آپ جاگتے میں بھی سوتے رہیں گے اور آپ ایک ایسا نشہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہمارا قومی نشہ ہے۔ اگر آپ کوئی سرکاری ملازم ہیں تو تو رشوت لینی شروع کر دیں اور اپنے دفتر کے سب ملازمین کو اس طرف راغب کریں اور اگر آپ پرائیوٹ ملازم ہیں تو آپ سب ملازمین کو اپنے ساتھ ملا کر بڑے غیر محسوس طریقے سے چیزیں غائب کرنے کا سلسلہ شروع کریں اور جو چیزیں غائب نہیں ہو سکتیں انہیں خراب کر دیا کریں اور مرمت اور ہر نئی خریداری پر کمیشن اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کھایا کریں تا کہ کوئی آپ کی شکایت نہ کرے۔ ہر 6 ماہ بعد دفتر کے سیکورٹی گارڈز اور عملے کو ساتھ ملا کر دفتر میں چوری کروا دیا کریں۔ اگر آپ کوئی دوکاندار ہیں تو کم از کم 60 فیصد چیزیں دو نمبر رکھیں اور ہمیشہ خالص کہہ کر بیچیں۔

اگر آپ گوالے ہیں تو پانی میں دودھ ملایا کریں اور لوگوں کو دودھ دیتے وقت یہ ضرور کہا کریں جناب ہم نے کبھی بھی دودھ میں پانی نہیں ملایا۔ اگر آپ کا ہوٹل ہے تو مردہ جانوروں کا گوشت استعمال کیا کریں یہ سستا مل جاتا ہے آپ کا منافع بہت بڑھ جائے گا۔ باسی اور خراب چیزیں تیز مرچ مصالحے اور خوشبوئیں ڈال کر گاہگوں کو دے دیا کریں۔ اگر آپ پٹرول یا موبل آئل کے کام سے وابستہ ہیں تو استعمال شدہ تیل کا رنگ بدل کر دینے والوں سے رابطہ کریں اور ہمیشہ وہی تیل ایک نمبر کہہ کر استعمال کریں۔ اگر آپ کا تعلق دوائیوں کے کام سے ہے تو ہمیشہ دو نمبر دوائیوں کا استعمال کریں اور پرانی سرنجوں کو دھو کر نئی سرنجوں کی جگہ بیچ دیا کریں۔ جب بھی مسجد جانا پڑے تو پرانی جوتی پہن کر جائیں اور واپسی پر کسی دوسرے کی نئی جوتی پہن کر آئیں۔ اگر کسی سے لڑائی ہو جائے تو شرافت سے بلکل پرہیز کریں بلکہ گھر میں بھی بیوی بچوں پر جلاد بن کر رہیں۔ بے ایمانی اور جھوٹ کو اپنا شعار بنائیں اور ایمانداری سے مکمل پرہیز کریں۔ مجھے امید ہے کہ مذکورہ بالا چند طریقوں کے باقاعدہ استعمال سے آپ کا ضمیر اور آپ دونوں ایسا سو جائیں گے کہ پھر کچھ بھی ہو آپ کی آنکھ نہیں کھلے گی اور اگر آپ کے قرب و جوار میں کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جو پاکستان سے محبت کی اور ایمانداری کی باتیں کرتے پھرتے ہیں۔ اپنے حقوق لینے کی بات کرتے ہیں ان سے دور بھاگیں اور ان کی بات ایک کان سے

سن کر دوسرے کان سے نکال دیں۔ ہمیں پاکستان سے کیا لینا دینا۔ یہ ملک روتا ہے تو روتا رہے۔ سیاستدان یا فوج کوئی تو ملک کو سنبھال ہی لے گا۔ ہمیں اس بات سے کیا مطلب کہ کچھ لوگ باری باری ملک کو لوٹیں ہمارے حقوق پر ڈاکا ماریں ہم نے تو پاکستان نشے کیلئے بنایا تھا۔ سونے کیلئے بنایا تھا۔ اسلئے اپنی تمام توجہ سونے پر مرکوز رکھیں۔

نوٹ: خبر ملی ہے کہ کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ عوام جاگ چکی ہے۔ اب ہم اپنے حقوق لے کر رہیں گے۔ ہمیں ہمارے حقوق دو۔ ان لوگوں سے مکمل پرہیز کریں ورنہ نشہ ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔

سچ صرف سچ

آجکل جتنے منہ ہیں اتنی ہی بولیاں نہیں بلکہ اس سے چار گنا زیادہ ہیں۔ سیاستدان ہوں یا پولیس۔ ہم زبان کا چسکا سب پر پورا کرتے ہیں۔ اگر پولیس ہی کا ذکر چھڑ جائے تو کہیں گے کہ پولیس تو بدمعاش ہے۔ ساری برائیوں کی جڑ بس پولیس ہی ہے۔ جیسے پولیس نہ ہو تو پاکستان میں جرائم ہی ختم ہو جائیں گے۔ یہ فرضی تبصرہ نگاری ایک ایسا قومی مسئلہ بن گئی ہے جو سچ کو ہمارے معاشرے میں پنپنے ہی نہیں دیتی جھوٹ کے نشتر سے سچ کا گلہ بیچ چوراہے پر سرعام کاٹ دیا جاتا ہے اور اس فرضی تبصرہ کی وجہ ہیں بد گمانی، جھوٹ اور باتوں کا چمپئین بننے کا چسکا۔ جس کو اور کچھ نہیں کرنا آتا وہ یہ کام ضرور کرتا ہے اور یہ جھوٹی باتیں آگ کی طرح ہمارے گھروں میں پھیل جاتی ہیں اور ہم ان باتوں پر اعتبار کرکے حقیقت شناسی سے اپنا دامن چھڑا کر حقیقت سے کہیں دور، ہوائی شکوے اور ہوائی کرداروں کی عمارت کھڑی کرکے بیٹھ جاتے ہیں اور اس عمارت سے کبھی نکل ہی نہیں پاتے۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ پولیس میں 70 فیصد لوگ کرپٹ ہیں تو پھر بھی ساری پولیس کو کرپٹ یا بدمعاش کہنا جھوٹ بھی ہوگا، الزام تراشی بھی ہوگی اور چند

اچھے لوگ جو ہم جیسوں سے تعداد میں بہت کم ہیں ان کے نزدیک اگر جھوٹ بولا تو بہتان بازی اور اگر سچ بولا تو غیبت ہوگی اور جب جھوٹ، بہتان بازی اور غیبت ہوگی تو بات ختم نہیں ہوگی بلکہ اس کا ردعمل یا نتیجہ مصیبت کے طور پر ہم پر نازل ہوگا۔ اگر بات سمجھ نہیں آئی تو دو منٹ کیلئے عملی مسلمان بن کر سوچ لیجئے سب سمجھ آ جائے گی۔ گھروں میں گھس کر مال لوٹنے اور زندہ انسانوں کو لاش بنانے والوں کی ایک طویل لسٹ ہے۔ اسی پولیس کے کئی شیر دل جوان ان سے عوام کی خاطر مقابلے کرتے ہوئے قبروں میں اتر گئے۔ لیکن ہمیں کیا ہم تو پولیس کے نام پر سبھی پولیس والوں کو اپنی بے لگام زبان سے رگڑا لگا دیتے ہیں۔ اس ملک کو ایٹمی قوت سائنسدان اور سیاستدان دونوں نے مل کر ہی بنایا ہے۔ لیکن ہم نے سیاستدان کو کرپٹ کے لفظ سے بدل دیا ہے۔ مانا کہ کرپشن انتہا پر ہے اس کی مذمت بھی ضروری ہے لیکن انصاف کے ساتھ۔ تنقید سچی ہونی چاہئے اور تنقید اور مذمت، قومی ذمہ داری سے کرنی چاہئے۔ یہ نہیں کہ اکثر کالی بھیڑوں کی خاطر بروں کے ساتھ ساتھ اچھوں کو بھی برا بنا دیتے ہیں۔ اکثر سیاستدانوں کی کرپشن سامنے آتی ہے تو ہم سب کو ہی کرپٹ کا خطاب دے دیتے ہیں اور الیکشن آنے پر انہیں کل کے کرپٹوں کو ووٹ دینے کیلئے بھاگے پھرتے ہیں۔ کسی شہر میں کسی ایک علاقے میں کچھ پولیس والوں کی بدعنوانی پر ہم سارے ملک کی پولیس کو اسی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ کسی ایک دفتر میں بدکرداری کا واقعہ سامنے آ جائے تو ہم ساری ملازمت پیشہ خواتین کو نشانہ

بنا ڈالتے ہیں۔ کوئی داڑھی رکھ کر غلط کام کرتا ہے تو ہم سارے داڑھی والوں کو برا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ کسی ایک گھر میں کسی ایک کی غلطی پر ہم اس کا سارا خاندان ہی بدنام کر ڈالتے ہیں۔

کوئی مسئلہ ہو، سیلاب ہوں یا بم دھماکے جو بھی ٹوٹی پھوٹی انتظامیہ ہی ہے جتنا سنبھالتی ہے یہی سنبھالتی ہے۔ یہ پولس والے ہی ہیں جو کئی کئی گھنٹے جاگ کر حالات کو کنٹرول کرتے ہیں اور ہم اپنے گھروں میں چین سے سوتے ہیں۔ یہ ہماری فوج ہی ہے جو عوام کیلئے جانیں دے رہی ہے۔ سیاستدان، پولیس، فوج ہمارے ہی معاشرے کا حصہ ہیں۔ پولیس والے ہم میں سے ہیں۔ عوام کی خدمت پر معمور افراد یا اداروں کو مضبوط بنانے اور ان کی کارکردگی بہتر بنانے کیلئے بڑا ضروری ہے کہ ہم ایماندار منصف بنیں۔ سچے نقاد بنیں۔ اپنے مقام کے مطابق ہر اچھے کام کی حوصلہ افزائی کرنا اور ہر غلط اقدامات کی اجتماعی مذمت ہماری قومی ذمہ داری ہے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو تب ہی تو حقیقت سامنے آئے گی۔ پھر ہی تو اس بات کا تعین ہو سکے گا کہ آج یہ ادارے کہاں کھڑے ہیں اور کہاں کتنی بہتری کی ضرورت ہے اور اگر ہم صرف ایک ہی رٹ لگاتے رہے پولیس بے ایمان ہے کرپٹ ہے۔ سب بے ایمان ہیں تو حقیقت ہمیشہ چھپی رہے گی اور اداروں کو بہتر بنانے کی ساری کوششیں بے اثر ثابت ہوں گی اور اگر اب بھی ہمارے اداروں کی کارگردگی کا گراف بہتر نہ ہوا تو ہمارے معاشرے کے مجرم مضبوط ہوں

گے اور نقصان عوام کا ہی ہوگا۔ اس وقت ہم نہایت نازک صورتحال سے گزر رہے ہیں اور سیاستدان، فوج، جج، صحافی ان سب میں اور جہاں بھی جتنی اچھائی ہے اور جتنی برائی ہے ہمیں سچ بولنا ہوگا۔ سچ کی پرورش کرنی ہوگی۔ صرف سچ اور اجتماعی سچ بولنا ہوگا یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اجتماعی طور پر خالص سچ بولیں، برائی کی مذمت کریں، تاکہ اچھائی کی پرورش ہوسکے اور برائی کی حوصلہ شکنی ہوسکے۔ ہم برا ہے برا ہے کی رٹ لگا کر اچھے کاموں پر بھی غلط کاموں کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ ہمیں ذاتی مفادات، پسند نا پسند، شخصیت پرستی سے ہٹ کر، سیاسی پارٹیوں سے بالاتر ہو کر حق کو سمجھنا ہوگا، حق کہنا ہوگا، حق لکھنا ہوگا، حق کا ساتھ دینا ہوگا چاہے یہ حق کہیں سے بھی ظاہر ہو اور ہمیں ہر غلط کام کی مذمت کرنی ہوگی چاہے یہ غلط کام ہماری اپنی صفوں سے ہی ظاہر ہو۔ جیسا ہم کرتے جائیں گے وہی تصویر بنتی جائے گی۔ ہمارا مثبت اور اجتماعی رویہ ہمارے اچھے مستقبل کی ضمانت ہوگا۔ ہم سچ بولتے رہیں گے اور سچ کی برکت سے ہی انصاف اور خوشحالی کا سورج طلوع ہوگا اور اگر ہم اب بھی یہ نہ کر پائے تو ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہئے کہ کل کا اندلس آج کا سپین ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو ہماری اجتماعی لاپروائیوں کے سبب پاکستان کے دشمن کا فائدہ ہو جائے۔

چار لفظوں کا کاروبار

کئی سال ایئر لائن میں کام کر کے چھوڑ تو دیا لیکن تجربہ اور یادیں تو میرے ساتھ ساتھ ہی ہیں۔ ایئر پورٹ کی بھی ایک علیحدہ ہی دنیا تھی۔ گھر جا کر سونے کے علاوہ دوستیاں، دلچسپیاں بھی ایئر پورٹ سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ کون نمازی ہے کون شرابی، کون سا لڑکا لڑکی محبت کا کھیل رہے ہیں اور کون شادی کرنے والے ہیں۔ کون ماہانہ تنخواہ پر گزارا کرتا ہے اور کون روزانہ تنخواہ جتنے پیسے اکٹھے کرتا ہے۔ سب کو سب کے بارے میں سب کچھ پتہ ہوتا تھا۔ سب کے اپنے اپنے گروپس تھے۔ ایک غیر اسلامی خاندان اور ماحول میں پرورش پانے کے باوجود میں شراب شباب اور حرام کمائی سے مجھے نفرت تھی۔ لہٰذا میرا بھی ایک گروپ تھا سب سے چھوٹا اور میرے جیسے لوگوں کا۔ اشعر، شیراز، خرم، راحیل، کامران، ندیم، فریال، عابیہ، افشین، نسرین، مہ رخ اور میں۔ وقت گزرتا گیا۔ مجھ سمیت سب کی شادی ہو گئی۔ لیکن فریال کی منگنی ٹوٹ گئی۔ فریال کے منگیتر کے گھر والے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن فریال کے والد بیمار تھے بہن بھائی چھوٹے تھے۔ فریال اکیلی کمانے والی تھی۔ قرضے کا بوجھ تھا۔ فریال نے شادی سے انکار کر دیا۔ چند ماہ بعد ناگزیر وجوہات کی بنیاد پر میری شادی شدہ زندگی کا بھی اختتام ہو گیا میرے سارے گروپ نے میرے تمام معاملات میں اچھے دوستوں کی طرح میرا ساتھ دیا اور

ایک دو سال بعد میں نے ائیر لائن کی نوکری چھوڑ دی۔ کچھ عرصے بعد فریال نے بھی نوکری چھوڑ دی اور کسی سے کوئی رابطہ نہ رکھا۔ کئی سالوں بعد میں گلشن اقبال پارک میں واک کر رہا تھا کہ میں نے فریال کو دیکھا۔ فریال اپنی فیملی کے ساتھ تھی۔ میں فریال سے اور اس کی فیملی سے ملا اور پھر میں اور فریال ایک کونے پر علیحدہ بیٹھ گئے۔ فریال نے مجھے بتایا کہ ائیر لائن سے جاب چھوڑنے کے بعد اس نے دو اور جگہ پر نوکری کی لیکن کہ تنخواہ میں گزارا نہیں ہو رہا تھا۔ مالی حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ قرض خواہوں نے جھگڑے شروع کر دیئے تھے۔ لہٰذا اس نے اپنا کاروبار کر لیا تھا اور کاروباری مصروفیات کی وجہ سے وہ کسی سے رابطہ نہ رکھ سکی تھی۔ لیکن اب اس کے ابو دوبارہ کام پر جانے لگ گئے تھے۔ بھائی باہر چلا گیا تھا۔ چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی تھی اور یہ کہ اب اس نے اپنا کاروبار ختم کر دیا تھا۔ آجکل وہ گھر پر ہی رہتی تھی اور بلکل فارغ۔ لیکن کاروبار تھا کیا۔ میں نے بار بار فریال سے پوچھا۔ بس پیسے اکٹھے کرتی تھی۔ فریال کی اس بات پر میری ہنسی نکل گئی۔۔ کام کیا تھا۔ فروخت کا۔ لیکن فروخت کیا کرتی تھی۔۔۔ میں نے پوچھا۔ آپ نہ پوچھیں۔۔۔ لیکن میں نے اصرار کیا۔ فریال نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکالا۔ اس پر کچھ لکھا اور مجھ سے کہنے لگی کہ لکھ دیا ہے۔ یہاں سے جا کر دیکھ لیجیے گا۔ لیکن میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ چھینا اور پڑھ لیا۔ چار لفظ لکھے تھے۔ میں نے پڑھا اور پڑھتا ہی رہ گیا۔ اس دوران فریال تو چلی گئی۔ لیکن وہ چار

لفظ آج بھی میرے سامنے ہیں۔ ''کپڑوں میں لپٹا جسم''۔

ہمارے ملک میں خصوصاً مڈل کلاس کے پرائیویٹ ملازمین کے حالات بہت خطرناک ہیں۔ مڈل کلاس کے پرائیوٹ ملازمین محنت سے کام کرنے کے باوجود اپنے کنبے کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتے۔ ان پرائیویٹ ملازمین کی کم تنخواہوں کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ ان پرائیویٹ ملازمین کو اس ملک میں کسی سہولت کا حقدار نہیں سمجھا جاتا۔ ساری سہولتیں اور تنخواہوں کے اضافے صرف سرکاری ملازمین کیلئے ہیں۔ یہ پرائیویٹ ملازمین ڈاکہ ماریں، خود کشی کریں یا اپنا جسم بیچیں کسی کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ پرائیویٹ ملازمین کیلئے تو قانون بھی حرکت میں نہیں آتا ان کیلئے کوئی لانگ مارچ نہیں کرتا۔ میں نے ایک جرائم پیشہ شخص کو بڑا سمجھایا لیکن وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا کہ میں اپنے اور گھر والوں کے خرچے کہاں سے پورے کروں۔ کاش پرائیویٹ ملازمین کے مسائل، ان کی تنخواہوں کے بارے میں بھی کوئی خبر آئے ان کے لیے بھی طبّی سہولتوں کے کسی پیکج کا اعلان ہو تاکہ آج کے بعد کوئی فریال چار لفظوں والا کاروبار کرنے پر مجبور نہ ہو۔ کاش--------------------------

انٹرویو ملک پاکستان کا

کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ اور۔ کوئی کہتا ہے پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا۔ کس وجہ سے قائم رہے گا اندلس کیوں قائم نہیں رہا۔ اسپین کیوں بن گیا۔ میری سمجھ میں تو نہیں آیا۔ تو ایک خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ کاش میں ملک پاکستان سے انٹرویو کر سکتا۔ رات ہوئی تو آواز آئی میرا انٹرویو کرنا چاہتے ہو۔ میں نے پوچھا آپ کون۔ آواز آئی پاکستان۔ آپ دیں گے میں نے پوچھا۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔ بہت کچھ۔ میں نے جواب دیا۔ اچھا چلو پوچھ لو۔ میں نے انٹرویو لیا اپنے لئے اور آپ کیلئے۔ پیش ہے۔ آپ بھی پڑھ لیں۔

سوال ۔ کیا آپ میرے سامنے آ کر بیٹھ سکتے ہیں؟

جواب ۔ ایک نہایت خوبصورت میدانوں، دریاؤں، سبزے اور لہاتی فصلوں پر پر مشتمل ایک خوبصورت جسم میرے سامنے ظاہر ہو گیا۔ جگہ جگہ، زخم تھے۔ خون نکل رہا تھا۔ بیٹھ گیا۔ جواب ملا۔

سوال ۔ آپ کے زخم میرے منہ سے نکلا۔

جواب ۔ رستے رہتے ہیں ۔ انٹرویو کرو۔

سوال۔ آپ کا حال ٹھیک نہیں ہے۔ کیسے کروں۔

جواب۔ 63 برس سے یہی حال ہے۔

سوال۔ اوہ کس نے کیا۔ سیاستدانوں اور جرنیلوں نے۔

جواب۔ نہیں۔

سوال۔ تو پھر کس نے کیا۔

جواب۔ میرے عوام نے۔

سوال۔ عوام نے۔ لیکن کیسے۔ میں سمجھا نہیں۔

جواب۔ سمجھاتا ہوں۔ مجھے عوام نے بنایا تھا۔ لیکن بنا کر مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ مجھے اکیلا پا کر سیاستدانوں نے جمہوریت جمہوریت کے نعرے لگائے مجھے پکڑ لیا۔ آج میرا حال تم دیکھ ہی رہے ہو۔

سوال۔ آپ نے عوام کو مدد کیلئے پکارا۔

جواب۔ 63 برس سے پکار رہا ہوں۔ کوئی سنتا ہی نہیں۔

سوال۔ سیاستدانوں نے جب آپ کو پکڑا تو آپ نے کہا کہ وہ جمہوریت جمہوریت کر رہے تھے۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کو کچھ سمجھ آئی ہے۔

جواب۔ صاف بات ہے۔ ہر کوئی اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ مجھے بنانے والوں کا مقصد اسلامی نظام تھا انہوں نے اسلام کا نعرہ لگایا۔ سیاستدانوں کا مقصد جمہوری نظام تھا انہوں نے جمہوریت کا نعرہ لگایا۔

سوال۔ اور جرنیلوں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔

جواب۔ سیاستدانوں جیسے ہی ہیں۔

سوال۔ آپ کی عوام آخر گئی کہاں۔ ان کا مقصد اسلام تھا اس مقصد کا کیا ہوا۔

جواب۔ عوام ہے تو یہیں ہے لیکن نہیں ہے۔

سوال۔ کیا مطلب۔

جواب۔ مجھے بنانے والے مسلمان قوم کہلاتے تھے۔ ان کا مقصد اسلام تھا۔ لیکن مجھے بنا کر پہلے انہوں نے اپنی قوم تبدیل کی۔ مسلمان سے پاکستانی قوم بن گئے اسلام کا مقصد چھوڑ کر بہت سارے دوسرے مقاصد بنا لئے اور مجھے سیاستدانوں کیلئے اکیلا چھوڑ دیا اور ان کا مقصد جمہوریت ہے۔

سوال۔ قوم تبدیل کر لی اس کا کیا مطلب ہے۔

جواب۔ جب میں نہیں تھا تو مجھے بنانے والے مسلمان کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ مسلمان ہونا کہلانا ہی ان کی اصل طاقت تھی۔ لیکن جب مجھے بنا لیا تو یہ مسلمان سے پاکستانی میں تبدیل ہو گئے۔ اپنی طاقت ختم کر دی اور پھر سندھی، پنجابی، بلوچی، بنگالی بن گئے۔ انہوں نے اپنی طاقت اپنا اتحاد اپنے ہی ہاتھوں ختم کر لی۔ جب مجھے بنانے والوں میں اتحاد نہ رہا۔ تو میرے بھی دو ٹکڑے ہو گئے مجھے کاٹ دیا گیا اور میرے دوسرے حصے کا نام بنگلہ دیش رکھ دیا گیا۔

سوال۔ آپ نے کہا کہ اسلام کا مقصد چھوڑ کر دوسرے مقاصد اپنا لئے۔ اس کی وضاحت کریں۔

جواب۔ اصل میں جب مجھے بنا رہے تھے تو اس وقت ان کا نظریہ تھا کہ مسلمان اور ہندو دو علیحدہ قومیں ہیں اور ہمارا رہن سہن اور زندگی گزارنے کا طریقہ ہندوؤں سے الگ ہے للذا ہم ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہ نظریہ ان کا مقصد تھا۔ ان کی طاقت تھی۔ لیکن جب میں بن گیا تو اپنی زندگی گزارنے کے طریقے کو ہندوؤں سے علیحدہ کہنے اور سمجھنے والوں نے ہندوؤں کے طور طریقے اسطرح اپنائے جیسے ان کا مقصد ہی یہی تھا۔

سوال۔ مثلاً کیسے۔ اس کی تفصیل بتائیں۔

جواب۔ اس کی تفصیل کی کیا ضرورت ہے۔ چند مثالیں ہی کافی ہیں۔ پہلے مسلمانوں کی اکثریت نماز پڑھا کرتی تھی۔ آج اکثریت ہندوؤں کی فلمیں ڈرامے دیکھنے کا کام کرتی ہے۔ ہندو خود بھی یہی کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کی شادی کرنے اور ہندوؤں کی شادی کے طریقے میں برائے نام ہی فرق ہے۔ میرے (پاکستان) کے پیدا ہونے سے پہلے سود کا کاروبار ہندوؤں کا شعار تھا۔ آج یہاں سارا کاروبار سودی ہے ہندوؤں کی تقلید ہے۔ ہندوؤں کے فلمی ہیرو یہاں کے لوگوں کے بھی ہیرو ہیں۔ غریب لوگوں کو حقیر سمجھنا اور ان کی حق تلفیاں ہندوؤں کا معاشرے کا رواج تھا۔ آج یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ بسنت ہندوؤں کا تہوار ہے یہاں بھی منائی جاتی ہے۔ ہندو چاہتے تھے کہ مسلمان ایک علیحدہ ملک بنانے کی بجائے ان کے طریقوں پر چلیں۔ مسلمانوں نے علیحدہ ملک پاکستان (مجھے) بنا کر شادی بیاہ کے معاملات میں ان کے طریقے اپنا کر فرق مٹا دیا۔ ہندو چاہتے تھے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ جائیں۔ گروپس میں بٹ جائیں تاکہ یہاں کے مسلمانوں کا اتحاد ختم ہو جائے۔ ان کی خواہشوں کو میرے اندر بسنے والوں نے خود عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ ہندو چاہتے تھے کہ پاکستان میں کوئی بڑا ڈیم نہ بنے ان کی اس خواہش کو بھی یہاں کی عوام نے پورا کیا ہے۔ میرے دو ٹکڑے کرنا ہندوؤں کی دیرینہ خواہش تھی۔ عوام نے ان کی خواہش خاموش تماشائی بن کر بخوبی پوری کی ہے۔ پہلے جب مسلمان داڑھی رکھتے تھے تو ہندو مسلمانوں کی

داڑھی سے نفرت کرتے تھے۔ آج مجھ میں بسنے والے یہ کام خود ہی کر لیتے ہیں۔ دودھ ہو یا مرچ۔ شہد ہو یا کوئی اور چیز خالص کہنے کا رواج ہے لیکن خالص بیچنے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ اب تم خود ہی سوچو۔ کیا یہ سب اسلام ہے۔ کیا یہی وہ مقاصد تھے جن کیلئے مجھے بنایا گیا تھا۔ کیا یہی نظریہ پاکستان تھا۔ مقاصد تبدیل ہوئے یا نہیں۔ میں نے جلدی سے سر ہلا کر تائید کی اور اگلا سوال کر دیا۔

سوال۔ چلیں آپ یہ تو مانیں گے کہ عورتوں نے تو بڑی ترقی کی ہے۔

جواب۔ کتنی ترقی کی ہے۔ کیا چاند پر پہنچ گئی ہیں۔ کتنی ایجادات کی ہیں۔

سوال۔ چلیں یہ تو مانتے ہیں کہ یہاں کہ لوگوں کی ہی بدولت آپ آج ایک ایٹمی قوت ہیں۔

جواب۔ ہوں ۔۔ایٹم بم کی بات کرتا ہے۔۔ کیا اسی لیے ایٹم بم بنایا تھا کہ ایٹم بم بنا کر غلامی کے سارے ریکارڈ توڑ دیں۔

سوال۔ کرپشن کے بارے میں کچھ کہیں گے۔

جواب۔ ہا ہا ہا ہا۔ مجھے کہنے کی کیا ضرورت ہے ہر گلی ہر محلے میں کرپشن خود

ہی سب کچھ کہتی پھر رہی ہے۔

سوال۔ یہ پولیس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

جواب۔ جیسے عوام ویسے سیاستدان۔ جیسے عوام ویسے جرنیل۔ جیسے عوام ویسی پولیس۔۔اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔

سوال۔ فوج کے بارے میں کیا خیال ہے۔

جواب۔ عوام ہی میں سے ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے فوج نہ ہوتی تو نہ جانے اس وقت میرا کیا حال ہوتا۔ میرے زخمی وجود کو تو دشمنوں نے کاٹ کر پھینک دیا ہوتا۔

سوال۔ آپ نے کبھی نصاب تعلیم دیکھا ہے۔

جواب۔ ہاں دیکھا ہے مسلمان کہلانے والوں نے مجھے اسلام کے نام پر بنایا تھا۔ جب مجھے بنانا تھا اس وقت اپنے اسلاف کے گن گاتے تھے اور اب غیر مسلموں کے گن گاتے ہیں۔ نصاب میں بھی اور نصاب کے باہر بھی۔

سوال۔ وہ کیسے۔

جواب۔ تعلیمی نصاب غیر مسلموں کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے۔ بچوں کو بچپن ہی سے ذہنی طور پر غیر مسلموں سے منسلک کیا جا رہا ہے۔ جیک اینڈ جل کی جگہ محمد

بن قاسم کے قصے بھی تو پڑھائے جا سکتے تھے۔
اور قارئین اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا انٹرویو روکنا پڑا کیونکہ بم دھماکوں کی وجہ سے پاکستان کی پہلے سے خراب حالت شدید بگڑ گئی تھی۔ اگر مجھے موقع ملا تو باقی انٹرویو کے ساتھ پھر کبھی حاضر ہوں گا۔

میٹھا جھوٹ اور کڑوا سچ

جھوٹ سے وقتی طور پر راحت ملنے کے بعد سدا کا دکھ مقدر بنتا ہے۔ لیکن سچ ایک ایسی دولت ہے جس سے وقتی طور پر اگر کچھ تکلیف ہو بھی جائے تو سچ سدا کی خوشی اور اطمینان کا سبب بنتا ہے۔ لیکن ہم۔۔۔۔۔ہم نے تو جھوٹ اپنی زندگیوں میں اس طرح نافذ کر رکھا ہے جیسے جھوٹ ایک سچ ہو اور سچ سے ہم اس طرح دور بھاگتے ہیں جیسے سچ کوئی زہر ہو جس کے کھانے سے ہم مر جائیں گے۔ لیکن کب تک۔ اب بہت ہو چکی۔ ہمیں اپنے ارد گرد کے سچ اور جھوٹ کھلی آنکھوں سے بغور دیکھنے ہی ہوں گے۔۔ اگر کوئی فرد کسی عمارت کی بیسویں منزل پر چڑھ کر اپنے آپ کو چھت سے نیچے باہر سڑک کی طرف گرا دے تو وہ نیچے گر کر مر جائے گا اور پاکستان بھی تو، عوام کی ہر شعبے میں، ہر قدم پر تنزلی کے باعث نیچے ہی جا رہا ہے اور نیچے گر کر تو بندہ مر جاتا ہے۔ زراعت، کاروبار، پانی، بجلی، کرپشن، ناانصافیاں، قرضے، اخلاقیات، دہشت گردی اور کتنا کچھ لیکن ہم روتے ہیں اور پھر کہتے ہیں اس ملک کو تو کچھ نہیں ہوگا یہ قائم رہے گا۔ کتنا میٹھا میٹھا جھوٹ ہے۔ سب، سب کچھ غلط کرتے جائیں (چند اچھے لوگوں کے علاوہ) اور سب، سب کو میٹھے جھوٹ بانٹتے جائیں۔۔بڑی مشہور روایت ہے کفر کا نظام تو قائم رہ سکتا ہے لیکن

ناانصافی کا نہیں۔ کون سی ناانصافی ہے جو یہاں نہیں ہوتی۔ یہاں تو نظام ہی ناانصافی کا ہے۔ بے ایمانی کا بول بالا ہے۔ اسلام کے نام پر حاصل کئے گیے ملک میں 63 برس میں بھی اسلامی قوانین نافذ نہ ہوسکے۔ شراب، شباب، ڈاکہ زنی، جوا، حق تلفیاں، عورتوں کی تذلیل، بوڑھوں کی تذلیل، بچوں کی تذلیل، جانوروں پر ظلم کونسا برا کام ہے جو یہاں نہیں ہو رہا۔ کیا نظریہ پاکستان یہی تھا۔ نظریہ تو کتابوں تک محدود رہ گیا۔ اسلامی طریقوں سے اجنبی، انڈین فلموں، ڈراموں اور ہیروئنوں کے رسیا عام ہیں۔ پانچ منٹ کی نماز کی بجائے گھنٹوں فلمیں ڈرامے دیکھنا آسان ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ نظریہ کوئی نیا، کوئی دوسرا ہی اپنا لیا ہے۔ پاکستان کی بنیاد، اس کو بنانے والی قوت تو ایک نظریہ تھا۔ وہ ہی نہ رہا تو کیا یہ ملک رہے گا۔ کہتے ہیں اس کو سب کھا رہے ہیں اب تک ہے تو ہمیشہ رہے گا۔ وہی میٹھے جھوٹ۔ جب ملک بنانا تھا تو اسلام اسلام کرتے کٹ گئے، مر گئے۔ مال جان سب کچھ لٹا دیا۔ اس وقت دعائیں مانگتے تھا۔ جب ملک بن گیا تو اب انڈین گانوں پر تھرکتے جسم دیکھتے ہیں بڑے شوق سے۔ شادیوں پر تو اپنے بچے بھی ناچتے ہیں۔ کالجوں میں بچیاں بھی۔ یہ ہم نے بچوں کو کیا بنا رہے ہیں کیا سکھا رہے ہیں۔ شادی پر ہندووانہ رسموں کی سختی سے، بڑی محبت سے پیروی۔ نتیجہ کیا ہے آدھا ملک چلا گیا۔ جو باقی بچا ہے اس سے نظریہ پاکستان رخصت ہو چکا ہے۔ ملک کا جانا باقی ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ایسے میں تو آواز لگانی تھی، شور مچنا چاہئے تھا، خبردار، ہوشیار ملک خطرے

میں ہے لیکن آواز لگ رہی ہے ملک کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس وہی میٹھا میٹھا جھوٹ۔ اب جھوٹ کو سمجھنے کا وقت ہے۔ زلزلہ کیوں آیا پھر نہ آ جائے، کوئی سوچنے کو تیار نہیں۔ چودہ سو سال ہو گئے اسلام کو تشریف لائے ہوئے۔ کم و بیش ساڑھے نو سو سال تو دنیا کے بڑے حصے پر حکومت کر چکے۔ جدھر قدم اٹھے تاریخ بنتی گئی۔ کل کے اندلس آج کے سپین میں کیا کرنے گئے تھے ایک غیر مسلم کی غیر مسلم بیٹی کو ایک غیر مسلم حکمران کے ظلم سے نجات دلانے۔ جو رعایا میں بھی نہ تھا۔ بس فریاد لے کر آیا تھا۔۔ لوگوں دنگ رہ گیے۔ اسلام کے جھنڈے اپنے گھروں پر، اپنے دلوں پر اپنی خوشی سے سجا لئے۔ اپنا ملک نہیں تھا لیکن اسلامی حکومت کی ابتدا ہو گئی۔ کیوں۔ کردار اسلامی تھا، سوچ اسلامی تھی۔ آج اندلس سپین ہے۔ عبرت ہے ہمارے لئے۔ اسلام کا نام وہاں --- موجود نہیں۔ غفلت کا شکار ہو کر کردار بدل گئے تھے شاعر مشرق بھی تو سچ بتا چکے۔

آ تجھ کو بتاؤں تقدیر امم کیا ہے
شمسیر و سناں اول طاوس و رباب آخر

آج ملک اپنا ہے اسلام کے نام پر بنا۔ لیکن ہم طاؤس و رباب کے سائے میں جی رہے ہیں۔ لیکن پھر کس امید پر کس سہارے پر کہتے ہیں اس ملک کو کچھ نہیں ہوگا۔ سوچنا ہوگا۔ بہت کچھ چھوڑنا ہوگا یا پھر تیار رہنا ہوگا جو کر رہے

ہیں اس کے برے انجام کیلئے۔ یہ ہمارے ارد گرد کے جھوٹ کا جائزہ تھا۔بڑا مختصر لیکن سچ کو بھی تو دیکھنا ہوگا۔ کتنا ہے کہاں ہے۔ کہیں سے آواز آتی ہے یہ سب ہمارے اعمال کی سزا ہے۔ لیکن ہم کان نہیں دھرتے۔ دھرتے ہوتے تو ویلنٹائن ڈے، بسنت بوکاٹا کی جگہ یوم توبہ مناتے۔ کچھ لوگ تو ہیں جو عمل کے سچے ہیں کردار کے کھرے ہیں۔ ہم ان کو دیکھتے اور اپنے آپ پر غور کرتے۔ لیکن یہ تو تب ہی ہوگا جب ہم کچھ محسوس کریں گے۔ لیکن سچ تو یہی ہے کہ ہم بے حس ہیں لیکن امید کی کرن بھی ہے فلم زدہ ذہنوں کے درمیان کچھ تڑپتے دعائیں کرتے لوگ۔ قتل وغارت، انسانیت کی تذلیل کیا کچھ نہیں ہو رہا لیکن سچ تو یہی ہے کہ مزاحمت بھی ہو رہی ہے دبی دبی سی۔ ویلنٹائن ڈے یا عیاشی ڈے پر پارک ہوٹل بھر جاتے ہیں، موبائل مصروف رہتے ہیں، لیکن مسجدوں میں بھی کچھ لوگ نظر آ ہی جاتے ہیں۔ ہماری شادیاں ہندوانہ رسموں کی تصویر ہیں لیکن ان سے بچ کر نکاح کرنے والے ابھی موجود ہیں۔ اس ملک کی بقا اور ترقی کا راز ہمارے کردار میں چھپا ہے اگر اسلامی ہو جائے۔۔ لیکن سارے لوگ فلم زدہ، رشوت خور، بے ایمان تو نہیں۔ تھوڑے سے، چند، قلیل تعداد میں، مٹھی بھر مسلمان بھی تو ہیں عملی مسلمان۔ مزاحمت کر رہے ہیں دہشت گردی کو اسلام کا روپ دینے پر، ہمارے غیر اسلامی رویوں پر۔ غیروں کی غلامی پر۔ ملک ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ ہماری فوج ڈٹ تو چکی ہے۔ مر بھی رہی ہے لیکن لڑتی جا رہی ہے کس کیلئے اس ملک کیلئے۔ یہ سب سچ ہی تو ہے۔ عدلیہ کی بحالی، کرپشن، معاف کیے گئے

قرضے، بڑے بڑے غیر ملکی اکاؤنٹ، غیر ملکی دوروں کے خرچ، عوام کے ٹیکسوں پر عیاشی، فرینڈلی اپوزیشن، میڈیا نے سیاستدانوں کے چہرے سے نقاب اتارنے کی کوشش تو کی ہے۔ سب نے تو بے ایمانی اور بد عنوانی کے چادر نہیں اوڑھ رکھی راتوں کو رو رو کر ملک کیلئے قوم کیلئے دعائیں کرنے والے بھی تو کچھ لوگ ابھی ہیں۔ حکمران بلکہ سیاستدان بمعہ اپوزیشن عوام سے روٹی، کپڑا اور مکان چھیننے کی مہم بڑے زور و شور سے شروع کر چکے ہیں لیکن ہماری سانسوں پر تو ان کا کوئی زور نہیں چلتا، نہ چلے گا۔ سانسیں تو ہماری اپنے ہی ہیں۔ میدان لگ چکا ہے۔ میٹھے جھوٹوں کی بھرمار ہے۔۔ سچ بھی سر اٹھا رہا ہے۔
هم نے، عوام نے جس کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جس
کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جس کا ساتھ دیا وہ قائم رہ جائے گا۔ جھوٹ کی جیت اور سچ کی جیت، جھوٹ کی ہار اور سچ کی ہار ہمارے کردار کی محتاج ہے۔ ہمیں اب اپنا کردار ادا کرنا ہی پڑے گا۔ فیصلے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ پاکستان کو قائم رکھنا ہے یا اسے مٹ جانا ہے۔ یہ فیصلہ اب ہمیں ہی کرنا ہے اپنے کردار سے۔ سچ اور جھوٹ میں کسی ایک کا انتخاب کرکے۔ یہی سچ ہے کڑوا سچ۔

شاندار

میں چھوٹا سا تھا جب میرے نانا نانی فوت ہو گئے تھے۔ میری والدہ کے گیارہ بہن بھائی پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری کوئی بہن بھی نہیں تھی۔ اسلئے میں لوگوں کو دیکھ کر اکثر حسرت کا شکار ہو جاتا۔ میری والدہ کی طرف کے لوگوں میں سے میرے والدہ کے چچا جان شریف اور میرے والدہ کی ممانی جان اقبال مجھے بہت پیار کیا کرتے۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں ہیں اور میرا ایک بچپن کا دوست تھا جمیل اور ہے بھی۔ ہم بالوں کے سٹائل سے لے کر کپڑوں کے فیشن تک حتی الامکان ایک جیسے رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ بچپن سے آگے تک اکھٹے ہی بڑے ہوئے تھے۔ جمیل کا تعلق ایک نہایت شریف خاندان سے تھا۔ جب میں ان کے گھر جاتا تو میں بھی اس گھر میں ویسے ہی رہتا جیسے وہ اپنے گھر میں۔ بلکہ اپنے گھر سے زیادہ خوش۔ میرے گھر میں میرا ہم عمر کوئی نہ تھا۔ میں جمیل کے سارے رشتہ داروں کو جانتا تھا اور وہ مجھے۔ دوستی تھی، پیار تھا، مذاق اور مزاح بھی۔ جو لوگ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے کردار میں کتنی ہی اونچ نیچ آ جائے لیکن شاندار لوگ شاندار ہی رہتے ہیں۔ جمیل کے چھوٹے بھائی شکیل کی منگنی ہو چکی تھی۔ میں کالج سے جمیل کے گھر پہنچا تو رات کے کھانے پر میری ملاقات فریحہ سے ہوئی۔ فریحہ جمیل کی خالہ

کی بیٹی تھی۔ برٹش نیشنل تھی اور کبھی کبھی پاکستان آیا کرتی تھی۔ اس دفعہ فریحہ بہت لمبے عرصے کیلئے پاکستان آئی تھی۔ فریحہ لندن میں رہتی تھی اور میں اس سے لندن کے بارے میں بہت سوال کیا کرتا تھا۔ فریحہ نے مجھے بتایا اویس بھائی کہ سارا انگلینڈ صاف نہیں ہے۔ لندن کی سڑکوں کے ساتھ راہگیروں کے لئے بنے ٹائلٹ تو اتنے گندے ہیں کہ آپ تو وہاں کبھی نہیں جا سکتے۔ میں نے بڑی حیرت سے یہ بات سنی۔ پھر ایک دفعہ فریحہ نے مجھے بتایا کہ لندن میں ایسے علاقے ہیں جہاں کالے ہر جانے والے کو لوٹ لیتے ہیں اور شہر میں جہاں بھی موقع ملے۔ ان سے بچ کر رہنا پڑتا ہے۔ چوریاں بھی ہوتی ہیں اور بے ایمانی بھی ہے۔ اکثر گورے ٹیکسی میں سفر کرکے پیسے ادا نہیں کرتے اور بھاگ جاتے ہیں۔ فریحہ نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ گھر کے نیچے گیراج سے شور کی آواز آئی۔ جب دیکھا تو پتہ چلا کہ پولیس چند ڈاکوؤں کو لے کر آئی تھی۔ ان ڈاکوؤں نے بہت بڑا ڈاکہ مارا تھا اور ڈاکے کی رقم ان کے گیراج میں چھپا گئے تھے۔ انہوں نے کسی طرح گیراج کا دراڑہ کھول لیا تھا۔ پولیس نے گیراج کا دروازہ توڑ کر تلاشی لی اور اندر سے پاؤنڈوں سے بھرے ہوئے تھیلے برآمد ہو گئے۔ پھر تو پولیس نے آپ لوگوں کو بھی بہت تنگ کیا ہوگا۔ نہیں انہوں نے ہمیں ساری کہانی سنائی، معذرت کی اور چلے گئے۔ میں نے لندن سے آنے والے کئی لوگوں کو سنا تھا وہ تو انگلینڈ کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتے تھے۔ جبکہ مجھے تو وہاں کی بس ایک ہی اچھی بات پتہ چل سکی تھی کہ وہاں قانون کی

حکمرانی تھی۔ جانے کیوں کچھ لوگ وہاں کے بارے میں جھوٹی کہانیاں سنا کر یہاں کے لوگوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرتے رہتے ہیں۔

فریحہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ فریحہ کو آئے کچھ دن ہی گزرے تھے۔ شکیل کے متوقع طے شدہ سسرال ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ میں باہر سے آیا تھا سب کمرے خالی تھے۔ میں ڈرائنگ روم میں گیا اور مہمان دیکھ کر واپس کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میری غیر موجودگی میں شکیل کی ہونے والی ساس نے میرے بارے میں جانے کیا کہہ دیا کہ شکیل کی والدہ کو اور سب کو برا لگا۔ بات بڑھ گئی اور بات کا اختتام یوں ہوا کہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ سب خاموش تھے میں نے جمیل کے کان میں کہا کہ فریحہ اور شکیل سے بات کرے اور اگر وہ دونوں راضی ہوں تو ان کا رشتہ بہت مناسب ہوگا۔ بات ہوئی اور کچھ دن میں رشتہ ہو گیا اور پھر آخرکار شادی بھی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد یہ ساری فیملی انگلینڈ شفٹ ہو گئی اور آج بارہ سال بعد میں، جمیل، جمیل کے والدین اور فریحہ اکٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ مائرہ بھی تو لندن ہی میں ہوتی ہے کبھی ملی ہے۔ میں نے پوچھا۔۔۔ مائرہ جمیل کی چھوٹی بہن کی دوست تھی۔ بچپن سے لے کر شادی تک اس گھر میں بڑی ہوئی تھی۔ یتیم تھی۔ بات چلتی گئی اور اور میں جمیل کا منہ دیکھنے لگا۔ بات ہی ایسی تھی۔ مائرہ جمیل کی چھوٹی بہن کی دوست نہیں بلکہ اس گھر میں کام کرنے آتی تھی۔ اس گھر والوں نے اسے کبھی نوکر نہیں سمجھا تھا۔ کبھی ڈانٹا نہیں تھا۔

وہ تو ان کے گھر میں بیٹی بن کر رہی تھی۔ اور یہ بات مجھ سے بھی چھپی رہی تھی۔ کبھی کوئی اسے نوکروں کی طرح سمجھتا تو تب ہی تو مجھے پتہ چلتا۔ مجھے سب سے پیار تو پہلے ہی تھا لیکن سب لوگ مجھے بہت شاندار شاندار لگے۔ ہم نے کھانا کھایا۔ پرانی یادیں تازہ کرتے رہے۔ اور بات شادیوں پر آ کر ٹک گی اور پھر میں فریحہ کا منہ تکنے لگا۔ اس نے بھی تو بات ایسی کی تھی۔ کسی ظالم ساس کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ فریحہ کے دو بیٹے ہیں اور فریحہ نیت کر رہی تھی کہ جب میرے بیٹوں کی شادی ہوگی میں تو کسی کی بیٹیوں کو اپنی بیٹی کی طرح رکھوں گی۔ کوئی فرق نہیں رکھوں گی۔ آخر میں بھی تو بیٹی والی ہوں۔ میں اس سارے گھر کو جانتا ہوں۔ تین بہوؤں کو بیٹیوں کی طرح خوش و خرم رہتے دیکھا تھا اور آج ان کی بہو بھی اس راستے پر چلنے کی نیت کر رہی تھی۔ واقعی شاندار لوگ شاندار ہی ہوتے ہیں۔ چاہے وہ پاکستان میں ہوں یا یوکے میں۔ میرے نظر میں وہ تمام بیٹیاں اور بہنیں آ گئیں جن کا ساسوں کے ظلم کی وجہ سے، کہیں نندوں اور کہیں خاوندوں کے ظلم کی وجہ سے ان کے اور ان کے پچھلوں کی زندگی ایک عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کاش ان کی ساسوں، نندوں اور خاوندوں کی سوچ بھی شاندار ہو جائے۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ خود بخود۔۔۔؟ یقیناً ہم سب کو اس کیلئے کوشش کرنی ہوگی اور اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ مذمت کرکے، پیار سے سمجھا کر، کسی طرح بھی۔ کیا میں، ہم، آپ وقت آنے پر ایسا کر سکیں گے۔

پاگل کون ہے

یہ ایک معمہ ہے جسے حل کرنے کیلئے مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ میرے گھر سے کچھ دور ہی خرم کا گھر ہے۔ ساری عمر انگلینڈ میں گزار کر اب ادھر آ کر بس گئے۔ لگتا ہے عیاش قسم کے گوروں کا گھر ہے۔ لیکن یہ صرف مجھے ہی لگتا ہے کیونکہ میں ان تین میں سے ہوں جو خرم کا دوست ہونے کی وجہ سے اس کے گھر کے حالات سے واقف ہیں۔ خرم کے ابو کا خیال ہے کہ خرم پاگل ہو گیا ہے اور خرم کے پاگل پن کی وجہ اس کی اپنے گھر کے ماحول سے بغاوت ہے۔

کل پھر خرم کے گھر میں لڑائی ہوئی تھی اور خرم میرے سامنے بیٹھا مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میں پاگل ہوں۔ یار آج فیصلہ کر کے ہی اٹھیں گے۔ شروع سے ساری باتیں بتا۔ میرے کہنے پر خرم شروع ہو گیا۔ خرم کی شیو بڑھی ہوئی تھی کیونکہ خرم نے گھر میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ داڑھی کی سنت ادا کرے گا۔ خرم نے یہ اعلان اپنی بہن کے سامنے کیا تھا جسے اس کی بڑھی شیو دیکھ کر بیمار ہونے کا شک پڑ گیا تھا۔ وہ تو اس بات کو مذاق سمجھ کر ہنس رہی تھی۔ اس وقت اس کے ابو اور بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے چسکیاں لگا رہے تھے۔ خرم نے مجھے بتایا کہ پاپا کے گلاس میں سے تھوڑی سی شراب ان کے کپڑوں پر بھی گر

گئی تھی اور ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ بس لڑائی شروع ہو گئی۔۔بڑی بحث ہوئی۔ خرم کی ممی بھی آ گئیں۔ سب نے کہا کہ اس کی صحبت خراب ہو گئی ہے۔ کسی نے کہا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ پاپا کو وہسکی پسند ہے۔ وہ پیتے ہیں اور مجھے داڑھی پسند ہے کیا میں داڑھی نہیں رکھ سکتا۔ یہ بات سن کر میں بھی چونک گیا۔ یار تو داڑھی رکھے گا۔ لمبی لمبی لٹکتی ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ نہیں۔ وہ لمبی لمبی لٹکنے والی خوفناک داڑھی نہیں رکھوں گا اور وہ سنت داڑھی ہے بھی نہیں۔ تو پھر۔ میں نے پوچھا۔ میں تو سنت داڑھی رکھوں گا صرف ایک مٹھی۔ صرف اتنی۔ خرم نے مجھے بتایا۔ تو پھر تو وہ بڑا سا رومال بھی باندھے گا سر پر۔ عجیب سا۔ میں نے پوچھا۔ اف نہیں یار۔ وہ رومال بھی سنت نہیں ہے۔ میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے باندھے ہوئے۔ میں نے کہا۔ یار ان کا اپنا فیشن ہے۔ میں ٹوپی پہنوں گا اور بعد میں عمامہ۔ اور عمامہ سنت ہے۔ اور اتنی خوبصورت کہ تیرا دل بھی کرے گا باندھنے کو۔ خرم بولا۔ لیکن یہ رومال کیوں باندھتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ جو باندھتے ہیں ان کو پتہ ہو گا۔ خرم کے اس جواب پر میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ خرم کی بتائی ہوئی باتوں پر اور اس پر کہ خرم کو یہ باتیں کیسے پتہ چلیں۔ اب بتا کیا میں پاگل ہوں۔ خرم نے سوال کیا۔ آخر میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتا کہ تجھے یہ سب کیسے پتہ چلا۔ میں نے جواب دیا۔ میں بھی آخر میں بتاؤں گا۔ خرم بھی اڑ گیا۔ اگلی بات بتا۔ میں نے بات کو آگے بڑھایا۔ یار روزہ رکھتا ہوں تو کہتے ہیں کہ کمزور ہو جائے گا۔

نماز پڑھتا ہوں تو کہتے ہیں کہ مولوی ہو گیا ہے۔ میں خرم کی اس بات پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بات بہت سیریس ہو چکی تھی۔ کیا یہ لڑنے کی بات ہے۔ خرم نے پوچھا۔ جواب آخر میں۔ آگے چل۔ میرے کہنے پر خرم آگے چلا اور کہنے لگا۔ کہ ہمارے گھر میں کتا ہے۔ میں کہتا ہوں ذرا احتیاط کیا کریں کہ اس کا تھوک ناپاک ہے اور اس کو صحن تک محدود رکھیں یا پھر گھر سے نکال دیں۔ یار تو پروفیسر کب سے بن گیا اور وہ بھی اسلام کا۔ میں نے خرم کو ٹوکا۔

یار دین کا علم حاصل کرنا فرض ہے۔ تو بھی مطالعہ کیا کر، میں بھی کرتا ہوں۔ خرم نے مجھے بتا ہی دیا تھا اور اگلی بات یہ ہے کہ میں اپنی بہن کو کہتا ہوں کہ مناسب کپڑے پہنا کرے۔ بے پردگی کا خیال رکھا کرے۔ اور اگر وہ نہیں رکھے گی تو کیا کرے گا اسے مارے گا۔ میں نے پوچھا۔ نہیں یار اسلام میں زبردستی کی اجازت نہیں۔ میں نے اچھے طریقے سے بتا دیا۔ بس میرا اتنا ہی فرض تھا۔ آگے اس کی مرضی۔ اوہ تو مار پیٹ۔ میں نے پوچھا۔ ہاں تو مار پیٹ۔ کسی کو اپنی بیوی کو بھی مارنے کی اجازت نہیں۔ اسلام تو اچھے اخلاق کا نام ہے۔ پیار ہے بچوں سے، ماں باپ سے، بیوی سے، بہنوں سے، ہمسایوں سے، سب سے۔ یہ جو مار پیٹ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا کوئی اپنا ہی طریقہ ہے اسلام کے نام پر۔ ہمارا اسلام تو قرآن والا ہے۔ بہن سے تو اس بات پر لڑائی ہوئی نہیں۔ لیکن اسے میری بات سمجھ بھی نہیں آتی وہ آگے سے ہنستی رہتی ہے لیکن پاپا مجھ سے

لڑ پڑتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ اب بتا کیا میں پاگل ہوں۔ خرم نے پھر پوچھا۔ یار اور کوئی بات ہے میں نے پوچھا۔ امید ہے ہو جائے گی جو حالات ہیں۔ خرم نے جواب دیا۔ یار جو تو نے کہا ہے — یہ سب ٹھیک ہے تو غلط نہیں ہے۔ تو پھر پاگل تو پاپا خود ہی ہوئے نا۔ خرم بولا۔ یار وہ تو جو ہوئے سو ہوئے لیکن قصور سارا گوروں اور ہندوؤں کا ہے۔ وہ کیسے میری اس بات پر خرم نے حیرانگی سے پوچھا۔ یار ہم پاکستان میں رہتے ہیں اور پاکستانیوں کی اکثریت کہنے کو مسلمان اور عملی طور پر گوروں اور ہندوؤں کی پیروکار ہے۔ لہٰذا وہ قصور وار ہیں۔ لیکن کیسے۔ خرم نے پوچھا۔ وہ ایسے کہ شادیوں اور کاروبار دوسرے معاملات میں ہم ہندوؤں کی پیروی کرتے ہیں اور کچھ معاملات میں گوروں کی پیروی کرتے ہیں۔ ہم بڑے تیزی سے ان کے رسم و رواج سیکھ رہے ہیں۔ اب چونکہ یہاں کہ لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں تو یہ سارے طریقے تو ان کے ہیں لہٰذا قصور بھی ان کا ہے۔ طریقے ان کے اور لڑائی تیرے گھر میں۔ خرم یہ سن کر ناراض ہو گیا اور مجھے کہنے لگا کہ غیروں کی تقلید کرنے والے اور اس کے ڈیڈی پاگل ہیں اور یہ کہ میں بھی پاگل ہوں۔ خرم نے مجھے بھی پاگل کہہ دیا ہے۔ پیارے قارئین معمہ یہ ہے کہ خرم کے پاپا خرم کو پاگل کہتے ہیں۔ خرم دوسروں کو پاگل کہہ رہا ہے۔ یہ پاگل ہے کون۔ خرم یا خرم کے پاپا اور مجھے پوری امید ہے کہ جو بھی پاگل ہے وہ تو ہو لیکن آپ پاگل بننے کی کوشش نہیں کریں گے۔ کیا خیال ہے۔؟

کرتوت

مسائل کا طوفان، نت نئے مسائل، بیچینیاں، خوف، مہنگائی کی آفت، نت نئی بیماریاں یہ سب انعام ہے ہمارے کرتوتوں کا۔ کافی لوگ ہیں ہمارے معاشرے میں جو کرتوتوں کا ادراک رکھتے ہیں لیکن بس زبان کی حرتک۔ تھوڑے سے ہیں جو ادراک بھی رکھتے ہیں اور کرتوتوں سے نالاں بھی ہیں۔ کچھ لوگ کرتوتوں سے لڑ بھی رہے ہیں لیکن عوام ان کا ساتھ ہی نہیں دیتی۔

ماضی کے کرتوت جاری ہیں۔ حال کے کرتوت ان میں شامل ہو چکے ہیں۔ اور مستقبل کے کرتوتوں کی لاشعوری منصوبہ بندی بلکہ صف بندی بھی ہو چکی ہے۔ کرتوتوں کی بے شمار قسمیں ہمارے معاشرے میں رائج ہیں۔ چند کا رونا درج ذیل ہے۔

بے ایمانی ایک نہایت ہی عام کرتوت ہے۔ اکثر خبریں چھپ چکی ہیں کہ چند منرل واٹر کی کمپنیوں کے علاوہ کسی کے پاس مطلوبہ پلانٹ ہی نہیں۔ بوتلیں دو نمبر عام ہیں۔

جوس کی تو بات ہی نہ کریں۔ سرسوں کے تیل میں اب سالن نہیں پک سکتا پہلے کبھی پکتا تھا۔ تیل دو نمبر ملتا ہے۔ گھی میں پکاتے ہیں۔ کوالٹی دو نمبر نہیں ہے بلکہ اس سے بھی نیچے مضر صحت۔ ایک تو سگریٹ اور وہ بھی دو

نمبر یعنی کریلا نیم چڑھا۔ خالص دودھ ، خالص شہد بھی بے ایمانی کی نظر ہو چکا ہے۔ لالہ موسیٰ مشہور ہے دو نمبر دوائیوں کیلئے۔ پھلوں میں انجکشن لگاتے ہیں لوگ میٹھا اور تازہ سمجھ کر لے جاتے ہیں۔ سفید رنگ والی مٹھائیوں میں سرف کا استعمال اب چھپا نہیں رہا۔ میں دوست کی دوکان میں بیٹھا تھا شیشے سے مشینری آتی نظر آئی۔ سوچا پورا ہفتہ ادھر نہیں آ سکتا۔ سڑک بنے گی۔ آدھ گھنٹے بعد باہر نکلا مشینری واپس جا رہی تھی۔ ایک لمبی سڑک بن بھی چکی تھی۔ بے ایمانی کی اعلیٰ مثال دیکھنے میں آئی۔ سڑکیں دو نمبر۔ بنے بنائے گھر بنی بنائی بلڈنگز، گھر بھی اکثر دو نمبر ناقص میٹریل استعمال کرتے ہیں۔ میری ممانی نے پلاسٹک کی مشینیں دیکھیں۔ گھر کیلئے خرید لیں۔ ہزاروں روپے دیئے تھے۔ ایک دن بعد کوئی بھی نہ چلی ۔ دو نمبر تھیں ۔ اب عام بکتی ہیں۔ کیلکولیٹر بھی دو نمبر۔ موبل آئل دو نمبر اور ڈبوں پر بڑی بڑی کمپنیوں کے نام لیکن ڈبے بھی دو نمبر۔ استعمال شدہ تیل میں کیمیکل ملا کر اس کا رنگ نئے جیسا کرتے ہیں۔ بیچ دیتے ہیں۔ لاہور میں بادامی باغ مرکز ہے۔ پٹرول پمپوں پر بھی یہی بکتا ہے دیدہ دلیری کے ساتھ ۔ اپنی بیوی گھر میں ہوتی ہے اور میاں صاحب دوسری لڑکیوں پر تانک جھانک کرتے نظر آتے ہیں۔ بے ایمانی ہی کی ایک شاخ ہے لیکن اسے کسی دوسرے نام سے بلاتے ہیں۔ الیکشن سے پہلے کہتے ہیں کہ غریب کو روٹی کپڑا اور مکان دیں گے اور الیکشن کے بعد لوگ روٹی، کپڑا، مکان کے ساتھ ساتھ بجلی، پانی، آٹا چینی ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ

بے ایمانی نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک ٹن کے ائیر کنڈیشنز میں 13000 بی۔ ٹی۔ یو ہوتے ہیں اور مارکیٹ میں بکنے والے ایک ٹن کے اکثر ائیر کنڈیشنر تو 1100 بی۔ ٹی۔ یو کے بھی نہیں ہوتے۔ اس کو بے ایمانی نہیں تو پھر کیا ایمانداری کہیں؟ سیاستدانوں کو قرضے ملتے ہیں اور معاف بھی ہو جاتے ہیں اور عوام کو کہیں بھی معافی نہیں ملتی۔ بے ایمانی ہی بے ایمانی ہے۔ اب تو انسان بھی بے ایمانی کی نزر ہو چکے ہیں۔ انسان لگتا ہے اور جب پستول نکال کر جیبیں خالی کراتا ہے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکو تھا۔ پرانی سرنجیں دھو کر نئی بنا کر بیچنا بھی تو ایک معمولی سی بے ایمانی ہے۔

آگے چلتے ہیں۔ پولیس بھی اس معاشرے کا تھوڑا سا کردار اور زیادہ کرتوت بن گئی ہے۔ آخر معاشرے کا حصہ ہے۔ اکثر ڈاکوؤں، بدمعشوں کی سرپرست پولیس ہی نکلتی ہے۔ ساس اور ظالم خاوند معاشرے کے بڑے سیاہ قسم کے کرتوت ہیں۔ کسی کی بہن، بیٹی کا وہ حال کرتے ہیں جو آپ دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ لالچی ہونا بھی ایک عام کرتوت بنتا جا رہا ہے۔ نکاح سے پہلے لڑکی کو پسند کرتے ہیں اور نکاح کے بعد پتہ چلتا ہے نظر تو باپ کی دولت پر تھی لڑکی کو سیڑھی بنایا تھا۔ عجیب کرتوت ہیں۔ خاوند اور ساس اگر اچھے ہوں تو کئی بہوئیں ہی کرتوت کا فرض نبھا لیتی ہیں۔

جلاد نما باپ اور خاوند ایک عام کرتوت ہے۔ بچپن میں گھر میں سر اور سینے میں سریا گھسا کر رکھتا ہے اور جب بچے بڑے ہو جائیں تو وہ سریے کو موڑ دیتے ہیں۔ عمل کا رد عمل تو پھر ہو ہی جاتا ہے۔ باپ کا کرتوت، اولاد کے کرتوت کو جنم دیتا ہے۔

بے زبان جانوروں پر ظلم و ستم پاکستانی معاشرے کا ایک بھیانک کرتوت ہے۔ گلی گلی گدھوں، گھوڑوں کی شامت آئی رہتی ہے، پلتے رہتے ہیں۔ ان بیچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ دیکھنے والوں میں، حکومت میں، پولیس میں، نام نہاد مسلمانوں میں کوئی ان کا ہمدرد بننا گوارا نہیں کرتا۔ ظالم لوگ اپنے بچوں کو خوش کرنے کیلئے اور خود بھی خوش ہونے کیلئے طوطوں کو مستقل چھوٹے چھوٹے پنجروں میں قید رکھتے ہیں۔ کیا معلوم پرندوں، جانوروں پر ظلم ہی ہم پر نازل مصیبتوں کی اہم وجہ ہو۔

اور ایک خطرناک، گستاخانہ کرتوت یہ ہے کہ مقدس کاغذات میں چیزیں بیچتے ہیں۔ اکثر مقدس کاغذات زمین پر گرے ہوئے ملتے ہیں اور کبھی کوڑے اور گندے پانی میں بھی۔ اگر ہم روپے پیسے سنبھال کر رکھ سکتے ہیں تو پھر مقدس کاغذات کیوں نہیں۔ یہ کرتوت مصیبتوں اور پریشانیوں کی ایک یقینی وجہ ہے۔ ۔

غیر مسلموں کے تہوار منانا بھی عوام کے پسندیدہ کرتوت ہیں۔ جیسے ویلنٹائن ڈے، بسنت، اپریل فول، وغیرہ۔ موقع ملتے ہی ایک دوسرے کی جائیداد پر قبضہ کرنا ایک معروف کرتوت ہے۔ بہنوں کو حصہ نہیں دیتے لیکن پھر بھی کچھ دے ہی دیتے ہیں۔ انڈین فلمیں ڈرامے تو ایسے رائج الوقت کرتوت ہیں کہ سارا معاشرہ ان کرتوتوں کی کرشمہ سازیوں سے متاثر نظر آتا ہے۔ خوبصورت چہروں والی لڑکیاں بن ٹھن کر سکرین پر نمودار ہوتی ہیں اور ہمارے بھولے عوام کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ مسلمان کہلانے والے لاشعوری طور پر، بڑے غیر محسوس طریقے سے فلموں ڈراموں میں لڑکیاں دیکھتے دیکھتے فیشن، گفتگو اور زندگی کے طور طریقوں میں غیر مسلموں کے پکے مقلد بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ پردہ دل میں ہوتا ہے۔ ہزاروں کام اور ہیں۔ کوئی کام دل میں نہیں ہوتا تو یہ پردہ دل میں کیسے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کو کچھ ایسے بھی پیدا ہو جائیں، کہیں ہم وضو بھی دل میں کر لیتے ہیں۔ نماز بھی دل میں پڑھ لیتے ہیں۔ بیوی خاوند سے پوچھے دو دن سے کوئی بات نہیں کی۔۔ خاوند بولے آجکل ساری باتیں دل میں ہی کر لیتا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو بے پردگی کی عادت چھوڑ نہیں سکتے اور ان باتوں سے اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تین گھنٹے کی فلم تو دیکھ لیں گے لیکن پانچ منٹ کی نماز نہیں پڑھ سکتے۔ انہی لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے جو ہر غیر اسلامی تہوار منانے میں پیش پیش ہوتی ہے۔ فلمیں ڈراموں میں جو دیکھتے ہیں ذہنیت بھی ویسی ہی بن جاتی

ہے۔ بیٹی چھوٹے چھوٹے کپڑے پہن کر نمائش کرتی پھرے خوش رہتے ہیں۔ بیٹا داڑھی رکھ لے گھر میں بھونچال آ جاتا ھے۔ جس گھر میں کوئی داڑھی رکھ لے وہاں بھونچال ایک عام سا کرتوت ہے۔

شراب، شباب، جوا، ریس بھی کوئی ڈھکے چھپے کرتوت نہیں۔ اور وہ کرتوت جن کا تعلق سیاست سے ہے اس کے لئے ایک کتاب لکھنے کی ضرورت ہے اور میں تو ایک تحریر لکھ رہا ہوں۔ یہ چند مثالیں ہیں ہمارے معاشرے میں رائج کرتوتوں کی۔ زلزلہ، بم دھماکے، مصیبتیں کرتوتوں کا انعام ہیں۔ ہم سمجھ ہی نہیں پا رہے۔ نہ سمجھیں گے تو بھگتتے رہیں گے۔ لیکن کب تک۔ آخر کب تک۔ دفتر، گھر، سیاست، ووٹ کیلئے پارٹی اور امیدواروں کی سلیکشن ہر جگہ، ہر قدم پر ہمیں اپنے کرتوتوں کا جائزہ لینا ہی ہوگا اور ایک سفر کا آغاز کرنا ہی ہوگا۔ کرتوتوں سے کردار تک کا سفر شروع کرنا ہی ہوگا، آج اور ابھی سے۔

عدالت عالیہ پاکستان-زندہ باد

تمام دنیاکے مسلمانوں کے محبوب نبی، مدینے کے پاک تاجدار، حضور نبی اکرم، محبوب پروردگار، جلا جلالہ ، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گستاخی ایک گستاخی ہی ہے۔ توہین ہے۔ دنیاکے لاکھوں مسلمانوں کے جذبات پر حملہ ہے۔ اس کی سزا اسلام میں موجود ہے۔ اس پر پوری دنیاکے مسلمانوں کا ایک ہی مؤقف ہے۔ اس پر کوئی بحث نہیں۔ جو لوگ باواسطہ یا بلاواسطہ اس گستاخی میں ملوث ہیں ان کیلئے تمام دنیاکے مسلمانوں کا ایک ہی مؤقف ہے اور سب کے سامنے ہے۔ گستاخی، دل آزاری اور آزادی اظہار رائے متضاد باتیں ہیں۔ اس گستاخی کو آزادی اظہار رائے کہنا ایک ایسا جھوٹ ہے جس کو مسلمانوں کا بچہ بچہ سمجھتا ہے اور اس جھوٹ یا بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسی لئے اس جھوٹ کے ڈرامے کو ناکام ہوتے دیکھ کر مسلمانوں کی صفوں میں موجود اسلام دشمن قوتوں کے صرف چند ہمدردوں نے بھی اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا ہے اور عدالت کے فیصلے کی مخالفت کے ساتھ پوری دنیاکے مسلمانوں کے جذبات پر حملے کرنے میں مصروف ہیں۔ کہتے ہیں کہ فیس بک پر پابندی کا طریقہ غلط ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ طالبعلموں کا نقصان ہو رہا ہے۔ کبھی کاروبار کا رونا روتے ہیں۔ کبھی سیاسی نقصانات سے ڈراتے ہیں۔ جبکہ فیس بک کوئی تعلیمی نہیں بلکہ ایک ایک فن سائٹ ہے۔ لے دے کر ایک ہی بات کہ فیس بک پر سے عدالت

نے جو پابندی لگائی ہے وہ ختم کر دی جائے۔ ان لوگوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ آخر فیس بک کے خلاف یہ احتجاج کیوں آ رہا ہے۔ ایسے لوگوں کی بات پر بھی غور کی ضرورت ہے اور ان لوگوں پر توہین عدالت، انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی حمایت اور فیس بک کی حمایت کرنے پر قانونی کاروائی کی ضرورت ہے۔

چند سال پہلے انڈین ایکٹرس کو کسی گوری نے ایک جملہ کہہ دیا تھا۔۔ اس پر نسل کشی کا الزام لگا۔ معاملے نے کافی طول پکڑا۔ کسی نے اس گوری کا دفاع نہیں کیا۔ کسی نے اس کو آزادی اظہار رائے کا غلاف چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ چند سال ہمارے ملک کے گلوکار نے جب اپنے ایک گانے میں ایک نسوانی نام کا استعمال کیا تو اس کی مخالفت ہوئی۔ باشعور لوگوں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ نام ہٹا دیا گیا۔ اور آزادی اظہار رائے کی کوئی آواز کہیں سے بھی بلند نہ ہوئی۔ ہمارے معاشرے میں اگر کوئی کسی کی بہن کو طلاق کے لفظ کہہ دے تو ان خاندانوں کے درمیان تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔ ہر سطح پر اس خاندان کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر ملنا جلنا ختم کر دیا جاتا ہے۔ کسی عقلمند اور کسی بیوقوف تک نے بھی آج تک ایسی باتوں پر آزادی اظہار رائے کی آواز بلند نہیں کی۔ لیکن آج جب پوری دنیا کے مسلمان غم و غصے کی آگ میں جل رہے ہیں۔ پاکستان کی عدالت نے غیرت ایمانی کا ثبوت دیتے ہوئے اور انسانی

حقوق کے تحفظ کے تحت ایک دلیرانہ اور درست مؤقف اختیار کیا ہے۔ تو چند نام نہاد لوگ آزادی اظہار رائے کی آڑ میں فیس بک کا دفاع کرنے کیلئے حرکت میں آ گئے ہیں۔ عوامی سطح پر قانون کے اندر رہتے ہوئے ان کی بھرپور مذمت بھی بہت ضروری ہے۔ آج اگر مسلمان طاقتور ہوتے۔ مسلمانوں میں اتفاق ہوتا تو کسی کو اتنی جرات نہ ہوتی۔ اور آج اگر ہم طاقتور بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی زندگیوں میں اسلام نافذ کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ اسلام ہی وہ طاقت ہے جس کی مدد سے مسلمانوں نے ماضی میں دنیا پر حکمرانی کی۔ یہ اسلام ہی ہے جس سے روگردانی کرکے ہم ذلیل خوار ہو رہے ہیں اور یہ اسلام ہی ایک واحد طاقت ہے جو ہمیں ہر قسم کے بحران سے نکال سکتی ہے۔ اسلام ہی ہماری پریشانیوں کا واحد حل ہے۔ اسلام ایک نظام ہے ایک راستہ ہے عروج کا، خوشحالیوں کا، ہمیں اس بات کو اب سمجھ جانا ہوگا۔ کیونکہ اب مزید وقت نہیں ہے۔ آیئے آج سے نیت کریں کہ ہم اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اسلامی اصولوں کی پیروی کریں گے اے رب ذوالجلال جلا جلالہ ہماری مدد فرما۔ آمین۔

اطلاع معزز عدالت اور وزیر اعلیٰ پنجاب کمپلینٹ سیل کیلئے اور انسانی حقوق کے نمائندوں کیلئے

اگر ایک بڑی سی دیگ میں پڑی کھیر کا ذائقہ جاننا ہو تو ایک چھوٹے سے چمچ میں کھیر لے کر اسے چکھ کر ساری دیگ کا ذائقہ جانا جا سکتا ہے۔ ساری دیگ چکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر صرف یہ دیکھنا ہو کہ پکا کیا ہے تو پھر بھی ایک چمچ ہی کافی ہے۔ یو فون پاکستان کی ایک بڑی موبائل کمپنی ہے۔ اسے ایک دیگ جانئے اور اب آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ دیگ کے اندر کیا ہے۔ لاہور میں 299 کے بلاک، سبزہ زار (ایل ڈی اے کی رہائشی کالونی) میں ایک بڑے پلاٹ میں یو فون کا ایک بلند و بالا ٹاور لگا ہوا ہے اور ٹاور سے متعلقہ انتہائی مہنگی مشینری اور مشینری کو ٹھنڈا کرنے کیلئے جو ایر کنڈیشنر لگائے گئے ہیں، یہ سب لگا کر اس بڑے پلاٹ کی کافی جگہ خالی بچ گئی ہے۔ مشینری کی حفاظت کیلئے ایک گارڈ موجود ہے اور گارڈ چونکہ ایک غریب آدمی ہوتا ہے۔۔۔ اس لئے اس گارڈ کو جانور کا درجہ دیا گیا ہے۔ گارڈ چوبیس گھنٹے یہیں رہتا ہے لیکن اس کے لئے اس بڑے سے پلاٹ میں کوئی واش روم نہیں ہے اور واش روم نہیں ہے تو استنجا خانہ بھی نہیں ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ جیتا جاگتا انسان کسطرح وقت گزارتا ہوگا۔ اگر یہ کوئی افسر ہوتا تو اس کیلئے واش روم تو کیا، ایک چھوٹا سے کچن بھی بن جانا تھا۔ یہ انسانی حقوق کی پاسداری (یو فون کے نزدیک) کی ایک اعلیٰ مثال ہے جو کہ یو فون کی دیگ سے

ایک چھوٹا چمچ ہے۔

پیارے قارئین آیئے اب لاہور شہر کے ایک محکمے واسا کو بھی ایک بڑی دیگ سمجھ کر اس کا بھی ایک چمچ لے کر دیکھ لیں۔ یہ جو 299 کے بلاک، سبزہ زار جہاں ایک انسان کو جانور کا رتبہ دیا گیا ہے اس کے بلکل سامنے ایک پارک ہے اور پارک میں واسا کا ایک ٹیوب ویل لگا ہوا ہے۔ اس ٹیوب ویل پر بھی ہر وقت ایک انسان کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور چونکہ یہ انسان بھی ایک غریب انسان ہے کوئی افسر نہیں ہے اسلئے اس کے لئے بھی کوئی استنجا خانہ، واش روم بنانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ اس دیگ سے بھی جو ڈش نظر آ رہی ہے وہ جانور کا درجہ پانے والا انسان ہی ہے۔

نوٹ : حسن ظن، بلکہ یقین یہی ہے کہ شہریوں کی فلاح کیلئے کام کرتا لاہور میں موجود وزیر اعلیٰ کا کمپلینٹ سیل اس بارے میں لاعلم ہے۔ لیکن اب علم ہونے کے بعد ان دو انسانوں کو انسان کی حیثیت دلانا تو ان کی ذمہ داری ہونی چاہئے۔

قارئین یہ لاھور شہر ایک دیگ کی طرح سمجھا جائے۔ تو دیگ یا شہر کے اندر ایسی داستانیں اور بھی ھیں جن کا ذکر کرنا کوئی ضروری نہیں کیونکہ ایک دیگ

سے ایک چیج ہی سب کچھ بتا دیتا ہے۔ صبح سے لے کر رات تک بارہ گھنٹے ڈیوٹی کرنے اور کم و بیش چار ہزار تنخواہ لینے اور چھٹی تو بہت مشکل سے لینے والوں سیکورٹی گارڈوں، چند بڑے ہوٹلوں کے علاوہ دوسرے ہوٹلوں پر معمولی تنخواہ پر کام کرنے والوں، کلینکس، دوکانوں کے سیلز مینوں، پرائیویٹ سکولوں کی اکثریت کے بیچارے اساتذہ، ٹریول ایجنسیوں کے ملازمین، گھریلو ملازمین، ڈرائیوروں اور پرائیویٹ ملازمین کی اکثریت کے حالات یہ دو چیج ہی بتا رہے ہیں کہ بڑی بڑی کمپنیوں اور اداروں کے غریب اور چھوٹے ملازمین کی حیثیت ایک جانور کی سے ہے۔ جب ان کو ایک استنجا خانے کی سہولت دینا مناسب نہیں سمجھا گیا تو تنخواہوں اور دوسری سہولیات کے بارے میں ان سے کیا سلوک کیا جاتا ہوگا۔ ان کے کام کے اوقات کیا ہوں گے۔ ان سے دفاتر میں بات کیسے کی جاتی ہو گی۔ ان کو چھٹی کتنی ملتی ہو گی۔ جہاں غریب ملازمین کو استنجا خانوں کی سہولت میسر ہے وہ بھی اس لئے کے ان کی ڈیوٹی ان دفاتر یا عمارات میں ہے جہاں بڑے افسران بھی بیٹھتے ہیں۔

یہ ایک پیغام ہے عدالت عالیہ کے نام۔ بہت سارے لوگ، کنٹریکٹ ملازمین عدالت کی مہربانی سے بچے ہو چکے ہیں۔ بہت سارے خوش قسمت ملازمین کی تنخواہیں بڑھ چکی ہیں لیکن پرائیویٹ اور غریب ملازمین کی اکثریت کی تنخواہیں مذاق کی حد تک کم ہی ہیں۔ یہ لوگ بھی اسی ملک کے شہری ہیں۔ ان کے بھی حقوق ہیں۔ عدالت

عالیہ سے درخواست ہے کہ کوئی کمیشن ان کے بارے میں بھی بنا دیں۔ جس کے رکن بڑے بڑے افسر نہیں بلکہ غریبوں کا احساس کرنے والے، درد مند، انسان دوست لوگ ہوں۔۔ ان کی تنخواہوں اور کام کے اوقات کے بارے میں بھی کوئی حکم جاری کر دیں۔ کوئی سو موٹو ایکشن ان کے لئے بھی لیا جائے۔ ایک سرکاری استاد کم و بیش 30000 روپے تنخواہ لے اور پرائیویٹ اساتذہ کی اکثریت 3000 سے 6000 روپے تک تنخواہ لے، یہ کوئی انصاف تو نہیں۔ سرکاری ملازم اور پرائیویٹ ملازم سے نوکری کے دوران اور نوکری ختم ہونے کے وقت ایک جیسا سلوک ہونا چاہئے۔ انصاف کا تقاضا یہی ہے۔۔ وقت کی آواز بھی یہی ہے۔۔ آخر دونوں اس ملک کے شہری ہیں۔

اس پیاری بکری جی کے نام

اے پیاری بکری جی کیا حال ہیں۔ آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہوگا۔ میں وہی ہوں جب لاہور کے ایک پوش علاقے میں آپ کا مالک آپ کو بڑی بے رحمی سے گھسیٹتا، مارتا ہوا جا رہا تھا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ آپ کو یاد ہے آپ کے ظالم مالک سے کتنا کھپنا پڑا تھا۔ سنائیں کیا حال ہیں۔ میں بھی لاہور ہی میں رہتا ہوں۔ کاش مجھے آپ کے گھر کا پتہ ہوتا تو میں آپ سے ملنے چلا آتا۔ ویسے بھی اس وقت آپ سہمی ڈری ہوئی تھیں پتہ پوچھنا مناسب بھی نہیں تھا۔ یقین کریں آج اتنے سال گزر گئے میں آپ کو بھول نہیں سکا۔ امید ہے آپ نے بھی مجھے یاد رکھا ہوگا۔ بس ایک درخواست ہے کہ مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھئے گا۔ آپ کے مالک کے بعد

میری اور بھی بڑے لوگوں سے بحث ہوئی۔ کئی دفعہ تو لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ لیکن میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ بس جلتا رہتا ہوں۔ کسی سے بات بھی تو نہیں کر سکتا۔ سوچا آج آپ ہی سے دل کا بوجھ بانٹ لوں۔ اب تو حالات اور بھی خراب ہو گئے ہیں۔ سڑکوں پر اکثر گدھوں کو موٹے موٹے ڈنڈوں سے بڑے ظالمانہ طریقے سے مار پڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ دھوپ، گدھے کی سکت سے زیادہ بوجھ، اوپر سے موٹے ڈنڈے کے ساتھ مار___ بس کیا کروں، گدھے روتے روتے میرے پاس سے گزر جاتے ہیں اور میں ان کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہوں۔ اب تو اس ملک کے رہنے والوں نے بیچارے طوطوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ ایک اڑنے والے آزاد پرندے کو کو ہمیشہ کیلئے ایک پنجرے میں بند کر دیتے ہیں۔ اور جب دل کرتا ہے اس کو دیکھ دیکھ کر ہنستے رہتے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ بیچارے کتوں کے بھی حالات بہت برے ہیں۔ جن کے گھر بڑے ہیں وہاں تو کتے بڑے آرام سے رہتے ہیں۔ لیکن جن کے گھر چھوٹے ہیں یقین کریں وہاں کتوں کے ساتھ بھی بڑا ظلم ہوتا ہے۔ سارا دن گلے میں پٹہ ڈال کر ایک کونے پر باندھ دیتے ہیں۔ دن رات ایک ہی جگہ پر بیٹھنے کی اذیت کا تو آپ کو بخوبی اندازہ ہوگا۔ کسی کے پاس اگر وقت ہو تو دن میں کسی وقت دو چار منٹ کیلئے باہر کا چکر لگوا دیتے ہیں ورنہ دن رات

وہیں بندھا رہتا ہے۔ اور آپ یقین کریں اس تپتی دھوپ میں کبوتروں کو چھتوں کے اوپر ڈربوں میں رکھا جاتا ہے اور ڈربے بھی ایسے کہ، نیچے فرش اور باقی چاروں طرف یا تین طرف جالی اور ڈربہ بند۔ اب اگر کبوتر آزاد ہوتے تو گرمی سے بچنے کیلئے کسی درخت یا سایہ دار جگہ پر چلے جاتے لیکن کبوتر سارا دن دھوپ میں ہی بند رکھے جاتے ہیں۔ کئی کبوتر تو مر جاتے ہیں۔ لیکن ان پر کوئی رحم نہیں کیا جاتا۔ آپ کو جب بھی اپنے مالک کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑے تو بس ان گدھوں، طوطوں اور کبوتروں کا حال یاد کر لیا کریں۔ آپ اپنی مصیبت بھول جائیں گی اور بس آپ کو کیا بتاؤں دکھ ہی دکھ ہیں۔ یہ جو پاکستانی بچے ہیں، پھول جیسے ، پیارے پیارے۔۔ان کا بھی برا حال ہے۔ یہ اگر نابالغ ہوں تو ان کا کوئی گناہ نہیں لکھا جاتا۔ جب تک کہ بالغ نہ ہو جائیں مر جائیں تو سیدھا جنت میں۔ لیکن کچھ کے علاوہ، ان کے ماں باپ ان کو بھی نہیں چھوڑتے۔ بس ذرا سی کوئی بات ہو جائے تڑاخ، تڑاخ تھپڑ پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لڑائی خاوند بیوی کی

آپس میں ہوتی ہے۔ غصہ بچے پر نکلتا ہے۔ عام طور پر یہ ظلم ظالم باپ ہی کرتے ہیں۔ اکثر مدرسوں میں بچوں کو ایسے ہی مارا جاتا ہے جیسے سڑکوں پر گدھوں کو۔ آپ یقین کریں ابھی حال ہی میں ایک خاوند جو اولاد نہیں چاہ رہا تھا اس نے مار مار کر ماں کے پیٹ میں موجود بیٹی ہی کی ہڈیاں توڑ دیں۔اب سوچیں اس کی ماں کو کتنی تکلیف پہنچی ہوگی۔ بیویوں پر ظلم بھی بہت عام ہے۔ میں نے خود ایک عورت کو بالکل گدھے کی طرح مار پڑتے دیکھی ہے۔ ارے آپ رو رہی ہیں۔ ان انسانوں کی خاطر جو جانوروں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آتے۔ دیکھیں آپ روئیں مت۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو رلا دیا لیکن میں بھی کیا کروں۔ کس کے پاس جا کر دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ ان ظالم لوگوں سے تو کوئی بات کرنا ہی بیکار ہے۔ یہ تو اپنے پیدا کیے بچوں کو نہیں چھوڑتے تو جانور، پرندے تو پھر پرائے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پتہ نہیں کون کون سا برا کام کرتے ہیں۔ یہ اس ملک کے حالات انہیں لوگوں کے برے کرتوت ہی کی وجہ سے یہاں تک پہنچے ہیں اور جب ان سے بچوں کے حقوق کی بات کرو۔ تو اسی وقت انہیں والدین کے حقوق یاد آ جاتے ہیں۔ انہیں یہ یاد نہیں

آتا کہ اسی اسلام میں بچوں کے بھی حقوق ہیں۔ سب بڑے آپس میں مل جاتے ہیں۔ یہ والدین کے حقوق کو بچوں کے ساتھ زیادتی اور ظلم کو چھپانے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ بچوں کے حقوق کی آواز کو دبا دیتے ہیں۔ اسلام میں بچوں کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ انہیں چہرے پر مارنا منع ہے۔ اصلاح کے طور پر مارنا بھی پڑے تو اس کا طریقہ ہے۔ مارنے کی کچھ حدود ہیں۔ بچے ماں باپ کے پاس امانت ہوتے ہیں۔ ماں باپ سے بچوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یہ سب کچھ انہیں دکھانے سے بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ سب بڑے ماں باپ ہوتے ہیں اسلئے ایک دوسرے کے ظلم پر پردہ ڈالنے کیلئے صرف ماں باپ کے حقوق بتاتے رہتے ہیں۔ حکمرانوں کا فرض ہے کہ بچوں، جانوروں، پرندوں پر ظلم، زیادتی نہ ہونے دیں۔ لیکن حکومت، عدالت کوئی بھی جانوروں، پرندوں اور انسانی بچوں کے حقوق کی کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ آئیں مل کر دعا کرتے ہیں کہ چیف جسٹس ہی جانوروں، پرندوں، انسانی بچوں کے حقوق کیلئے کوئی فوری ایکشن لے لیں اور انسانی بچوں، جانوروں کو مارنا قانونی طور پر جرم قرار پائے، اڑنے والوے پرندوں کو قید کرنا بھی ممنوع ہو جائے۔ پیاری بکری جی چلتا ہوں لیکن آپ یہ دعا کرتی رہنا اور آخر ہم کر

بھی کیا سکتے ہیں۔ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ جب میری شادی ہوگی تو میں اپنے بچوں پر
ظلم نہ کروں اور ہمارے گھر میں کوئی طوطا، کبوتر قید نہ ہو اور یہ میں ضرور کروں گا۔
آپ دیکھ لینا۔ اچھا پھر کبھی ملیں گے۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔

تاریخ کا پاکستانی موسم

چاند ستارے سب اپنے وقت پر نکلتے ہیں اپنے وقت پر چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک دم نہیں نکلتے۔ مثلاً سورج ہی کو لے لیجئے پہلے رات جانا شروع ہوتی ہے۔ پھر تھوڑی سی روشنی ظاہر ہوتی ہے یہ آثار ہوتے ہیں پھر آہستہ آہستہ روشنی بڑھتی جاتی ہے اور یہ بلکل واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ اب سورج نکلنے والا ہے اور پھر سورج نکل آتا ہے اور دھیرے دھیرے پوری آب وتاب سے چمکنے لگتا ہے۔ بہت کم لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سورج نکلنے کے آثار تھے لیکن نہیں نکلا۔ بادل آ جاتے ہیں اور بارش کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور بارش ہو جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بارش ہو جاتی ہے لیکن بارش نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ یہ تمام ایک فطری عمل ہے اور ہم اس کو موسم کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایک موسم اور بھی ہوتا ہے اور یہ ہوتا ہے تاریخ کا موسم۔ اسی طرح کے ملتے جلتے موسم اس دنیا کی تاریخ میں بھی چلتے رہتے ہیں اور ان میں بھی کبھی کبھی لیکن بس کبھی کبھی تغیر و تبدل بھی ہو جاتا ہے۔ رفتار بہت آہستہ آہستہ ہوتی ہے اور آثار بھی۔ بہت دیر سے واضح ہوتے ہیں۔ 14 اگست 1947 کو تاریخ کے دھارے پر پاکستان کے نام سے جو سورج چمکا اس کی روشنی بہت دیر پہلے چند درد مندوں کی محفلوں میں اس وقت ظاہر ہوئی جب ہر طرف انگریز کے نام کا اندھیرا

ہی اندھیرا تھا اور پھر آہستہ آہستہ یہ روشنی بڑھتی گئی اور جناح صاحب کے مسلم لیگ میں آتے ہی ایک دم موسم بدل گیا۔ کانگریس کے اندھیروں کو اپنے آپ کو مسلمان ہی کہلانے والوں نے گاندھی کی پالیسیوں کا حصہ بن کر بہت بڑھا دیا، اکبر الہ آبادی بیساختہ پکار اٹھے،

کانگریس کے مولوی کی کیا پوچھتے ہو کیا ہے
گاندھی کی پالیسی کا اردو میں ترجمہ ہے

لیکن موسم بدلتا رہا تاریخ کے لمحوں پر نکلنے والے سورج کے آثار بڑھتے گئے اور 14 اگست 1947 کو یہ سورج بڑی شان سے طلوع تو ہو گیا لیکن دھیما دھیما سا، رات کے سایوں میں۔ آج 63 برس گزرنے کے بعد بھی اس سورج کی روشنی گھٹتی زیادہ اور کبھی تھوڑی سے بڑھ بھی جاتی ہے۔ نا اتفاقی کی بڑی خطرناک بجلی چمکی تھی، جب بنگلہ دیش بن گیا تھا۔ یہ تاریخ کے موسم اصل میں قوموں کے کردار کے مطابق چلتے ہیں اور اسی کردار کے مطابق گھٹتے بڑھتے ہیں۔ آیئے تاریخ کی دوربین سے تھوڑا پیچھے دیکھتے ہیں۔

واہ کیا موسم ہے مسلمانوں کے گھوڑے کل کے اندلس اور آج کے سپین میں پہنچ گئے ہیں۔ ایک غیر مسلم کی فریاد پر ایک غیر مسلم لڑکی کی عزت ایک غیر مسلم حکمران سے بچانے۔ کیا لوگ تھے ان کے قدموں سے اڑنے والی خاک سے تاریخ بن

رہی ہے۔ روز روز نئے سے نئے سورج طلوع ہوتے ہی چلے گئے اور کئی سو سال بڑی شان سے چمکتے ہی رہے۔ کمال کے لوگ تھے۔ تاریخ ان کی غلام تھی۔ ان لوگوں نے اپنے موسم خود تخلیق کئے۔ اب وہ لوگ دنیا سے چلے گئے اب تو ہم ہیں۔ تاریخ کے غلام۔ تاریخ کی آندھیوں میں ادھر سے ادھر خشک پتوں کی طرح اڑتے ہوئے۔ پوری دنیا کے مسلمانوں میں چند ہوں گے ضرور، بلکہ ہیں، تاریخ کے موسموں کے آگے ڈٹے ہوئے۔ لیکن آٹے میں تھوڑا نمک ہو تو آٹا ہی کہیں گے۔ مجموعی صورتحال تو یہی ہے کی مسلمانوں کی تاریخ، غیر مسلم لوگ آپس کے ظالمانہ اتفاق سے لکھ رہے ہیں۔ موضوع اپنا ملک رکھنا ہے لہٰذا اپنے ملک میں بھی تو یہی حال ہے۔ ادھر سے ادھر اڑتے پھرتے ہیں۔ گھپ اندھیری رات ہے۔ مہنگائی، دہشت گردی، ناانصافی، رشوت، بے ایمانی، لاقانونیت کے بگولے عوام کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھینکتے رہتے ہیں۔ عوام اس سفر کے عادی ہو چکے ہیں۔ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ عوام کبھی کچھ نہیں کرے گی۔ بس اس بات نے میرا قلم چھیڑ دیا ہے۔ کیا میرے محترم دوست صحیح کہتے ہیں۔ لیکن میں کیسے مان لوں۔ میں نے سنا ہے کہ تاریخ کے موسم بھی ایک سے نہیں رہتے۔ اس اندھیری میں کہیں ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی تو ہے۔ میرے محترم دوست کہتے ہیں کہ کوئی ہر کوئی کسی نہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ ہے۔ میں ان کو یہ بتانا چاہتا ہوں۔ جناب ہر کوئی نہیں۔ کچھ کچھ لوگ کچھ سیاسی پارٹیوں سے وابستہ ہیں لیکن جناب جب الیکشن ہوتا ہے تو ان لوگوں سے کہیں زیادہ لوگ ایک بڑی تعداد ووٹ

ہی نہیں ڈالتی، الیکشن میں حصہ ہی نہیں لیتی، یہی تو سیاسی پارٹیوں پر عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ لیکن یہی لوگ چیف جسٹس کو بحال کروانے کیلئے میدان میں تھے۔ یہ صرف عوام کا اپنا شو تھا جس کا ہیرو عوام خود ہی تھی۔ میڈیا کے چند لوگوں اور عدالت کے چند لوگ عوام کے اسی گروپ کے ساتھی ہیں۔ یقین کریں اب تو فوج بھی پیچھے نہیں ہے۔ اب آپ کہیں گے جناب فائدہ کیا۔ جناب فائدہ ہے، یہ روشنی کی ایک کرن ہے، چند لوگوں نے چراغ جلایا ہے۔ ابھی وقت لگے گا، جب یہ روشنی مزید پھیلے گی آپ کو شاید پھر ہی نظر آئے گی۔ لیکن ہمیں تو نظر آتی ہے۔ قارئین، اگر آپ چاہتے ہیں یہ روشنی جلتی رہے، بڑھتی رہے۔ اگر چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی جگہ بدلنی ہوگی۔ اس اندھیرے سے نکل کر ان چراغ جلانے والوں کا ساتھ دینا ہوگا۔ اپنی سوچ سے، اپنے عمل سے، اپنے مفاد پر اپنی قوم کے مفاد کو ترجیح دے کر، ان چراغ جلانے والوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر۔ رشوت، جھوٹ، بے ایمانی، ملاوٹ، سود، چوری چکاری اور ہر وہ کام جس میں ملک و قوم کا نقصان ہے اسے چھوڑ کر۔ یہ سب ہمارے ملک میں چلنے والی سیاہ اندھیری کے بگولے ہیں۔ انہیں چھوڑ دیں، ان بگولوں کے چکر سے نکل کر روشنی میں آ جائیں اور اپنی ہمت اور حیثیت کے مطابق آپ بھی روشنی کیجئے۔ تاریخ کے موسم کو قابو میں کر لیجئے۔ آئندہ کا سورج آپ کی مرضی کا نکلے گا لیکن دیر کے بعد لیکن جلدی نکلنا ناممکن بھی نہیں۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔ شکریہ

سائنسدان مسلمان ہوگیا، لیکن ہماری بے عملی کب دور ہوگی

مریضوں کی ایک سٹیج ایسی بھی ہوتی ہے جب ان پر کوئی دوائی ہی اثر نہیں کرتی۔ لہٰذا پہلے غالب مسئلے کا علاج کرکے ہی پھر دوسرے مسائل کو دیکھا جاتا ہے۔ جیسے ایک مریض کا معدہ ہی خراب ہے تو اس کے معدے کا علاج ضروری ہے ورنہ کھانے، دوائی کا کچھ اثر نہ ہوگا اور اگر مریض کے جسم کے تمام یا اکثر اعضاء میں خرابی ہو چکی ہو اور مریض ابھی زندہ ہو تو ڈاکٹر اس کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر ایسی حالت میں مریض تعاون نہ کرے، زندہ ہی نہ رہنا چاہے تو پھر ڈاکٹروں کیلئے مریض کو بچانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی عوام بھی ایک ایسا ہی مریض ہے جو سر سے لے کر پاؤں تک طرح طرح کے امراض (مسائل) میں مبتلا ہے لیکن یہ علاج کیلئے تیار ہی نہیں۔ اس مریض کو ابھی بھی کوئی فکر نہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان لٹکتی عوام نہ تو اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہی ہے اور نہ ہی اپنی بھیانک موت کا ادراک کر رہی ہے۔ (صرف چند لوگوں کے علاوہ)۔ اس مریض (عوام) کے تمام جسم پر زخم (مسائل) ہیں، اور زخمی کی یہ حالت دیکھ کر اس ملک کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے سیاست کے نام پر اس کے جسم پر یلغار کر رکھی ہے۔ نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں لیکن اسے کوئی پروا نہیں، یہ درد سے روتا اور چیختا ضرور ہے لیکن اپنے آپ کو انڈین فلموں، کرکٹ اور فٹبال کے

میچ، دیکھنے میں مصروف کر لیتا ہے۔ ٹی وی سکرین پر خوبصورت چہروں اور ڈراموں سے دل بہلاتا ہے۔ سیاستدانوں کو ووٹ ڈالتا ہے اور سیاستدانوں کے خلاف جلوس بھی نکالتا ہے۔ نہ جیتا ہے نہ مرتا ہے لیکن ایسے ہی چلتا جا رہا ہے۔ اس کو آخر کب تک ایسے ہے چلتے جانا ہے، بغور سوچنے، سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔

کیا ہمارا حال مذکورہ بالا سطور سے مختلف ہے۔ بالکل بھی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ خراب۔ اگر کسی مریض کو ڈاکٹر نہ ملے، دوائی نہ ملے تو اور بات۔ لیکن ہمارے پاس تو اسلام نام کا ڈاکٹر ہے، اسلام نام کی دوائی ہے، ہر مرض سے یقینی شفا اسلام کے نام سے موجود ہے۔ ہر مسئلے کا حل، ہر مشکل سے نجات کا فوری حل اسلام، اسلام، اسلام موجود ہے۔ کبھی ہم نے اس پر غور کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بیرونی سازشوں کے تحت، اسلام سے بیگانے نظام تعلیم کی وجہ سے، انڈین فلموں کے سیلاب نے ایسے لوگ یقیناً پیدا کر دیئے ہیں، جو اسلام کے نام پر اسلام دشمن نظریات کے پیروکار بن چکے ہیں۔ لیکن ہم آخر ان کے ساتھ ان کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہیں۔ کیا ہمیں کوئی مجبوری ہے۔ اگر کوئی اسلامی حلیہ اپنا کر، داڑھی رکھ کر غلط افعال میں ملوث ہے، اگر ایسوں کا پورا گروہ ہے۔ تو دین اسلام ان کی ہم سے زیادہ اور ہم سے پہلے سخت مذمت کرتا ہے۔ ان کی حرکتوں کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ اسلامی تعلیمات میں کوئی

کمی ہے اور ہمیں ان کو چھوڑ کر دوسروں کے طریقے اپنا لینے چاہئیں۔ جانثاران مصطفٰے کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دو نہیں کئی سال اسلامی طریقوں پر عمل کرکے دنیا پر حکمرانی کی ہے۔ معاشیات ہو یا سیاسیات، گھریلو زندگی ہو یا کاروبار، اندرون مسائل ہوں یا دشمنوں کی سازشیں، دہشت گردیاں اور قحط، زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی و کامرانی حاصل کرکے دکھائی ہے۔ تاریخ کہیں بھاگی تو نہیں۔ ہم نے اسلام سے عملی طور پر منہ موڑا تو ہماری بداعمالی، عیاشی اور غداری ہمارے زوال کی وجہ بن گئیں اور آج ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں، اپنی اپنی حیثیت میں رہ کر کرتے بھی ہیں لیکن اسلام سے عملی پرہیز کے ساتھ۔ کیا ہم اپنی زندگیوں میں، اپنے جسموں پر، اپنے خیالات پر، اپنی حرکتوں پر اسلام نافذ نہیں کر سکتے۔

سوچئے غور کیجئے، مسئلہ کیا ہے۔ غیروں کی تقلید میں بسنت مناتے ہیں، اپریل فول مناتے ہیں، ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں۔ ذرا اپنے دن رات اسلام کے مطابق بھی منا کر دیکھ لیں۔ رکاوٹ کیا ہے، ذرا سوچیں کہ آخر وجہ کیا ہے۔ اسلام تو رہے گا، ہم نہیں رہیں گے۔ زندہ ہو کر بھی مردہ رہیں گے۔ پاکستان ایک تختہ ہے۔ عوام و خواص، نیک و بد، امام و مقتدی، امیر غریب، داڑھی والے اور بغیر داڑھی والے کیسے ایک ہو گئے تھے۔ دعائیں مانگی تھیں۔ ہر سازش کا مقابلہ کیا تھا۔ اُس وقت بھی تو کچھ داڑھیوں والوں، اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والوں، نمازیں

پڑھنے، پڑھانے والے ملاؤں نے کانگرس کا ساتھ دیا تھا۔ گاندھی کو اپنا لیڈر مانا تھا۔ لیکن ہر سازش کو ناکام بنا دیا۔ پاکستان بن گیا۔ اب کیا ہو گیا۔ اپنے خلاف ہونے والی سازشیں سمجھ ہی نہیں آتیں یا سمجھنے کی فرصت ہی نہیں ہے۔ مہربانی فرمائیں اور اپنی زندگیوں میں اسلام نافذ کر لیں۔ نیت کرنا بھی فوری آغاز کے مترادف ہے۔ کر لیں۔ سب کچھ تو کرتے ہیں، یہ بھی کر لیں۔ نحوستوں سے نکل کر برکتوں میں آ جائیں۔ فرض کریں پاکستان میں کل 100 لوگ رہتے ہیں۔ اگر 70 لوگ اپنے زندگیاں اسلام کے مطابق ڈھال لیں۔ پوری نہیں صرف 50 فیصد ہی ڈھال لیں۔ تو کیا ہوگا۔ اسلام عرب میں طلوع ہوا تھا، برکتیں ساری دنیا تک پہنچ گئی تھیں۔ تو اب بھی ایسے ہی ہوگا، نہ صرف 70 لوگوں کے، بلکہ باقی 30 لوگوں کے دکھ درد ختم ہونے جیسے ہی ہو جائیں گے۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہو جائیں گے۔ سب خوشحال جیسے ہی ہو جائیں گے۔ غریبوں کی عزت محفوظ ہو جائے گی۔ ملک میں امن کا نظام چلے گا۔ تو ڈھلیں فوراً اسلام میں، آخر غیر اسلامی نظام میں بھی 100 فیصد تو ڈھلے ہی ہیں اور کتنا تجربہ باقی ہے، اسلام سے بغاوت کر کے اور کتنی ذلت اٹھانی باقی ہے۔ اسلام پر عمل کرنے والوں نے دنیا سنبھال رکھی تھی، ہم سے اپنا آپ نہیں سنبھالا جا رہا، قربانیاں دے کر ملک حاصل کیا، لیکن پھر اتنے کمزور ہو گئے کہ آدھا حصہ ہی گنوا دیا، سنبھالا ہی نہیں گیا۔ کبھی سوچا ہے کہ یہ ملک اسلامی نظریہ کی طاقت سے حاصل کیا تھا۔ نظریہ سے پھر گئے، طاقت گئی اور آدھا ملک بھی۔ اسلام

ہی مکمل طاقت ہے، اسے اختیار کریں، طاقتور بن جائیں، اگر نہیں اختیار کرنا تو پھر اب کیا کرنا ہے۔

اگر کسی کو یہ سب پڑھ کر ہنسی آ رہی ہے تو اس کو عرض ہے کہ کاش آپ کو اسلامی اصولوں سے اور ان پر عمل کے سبب نازل ہونے والی رحمتوں کا کچھ تو شعور ہوتا۔ زیادہ نہیں تو اسلامی تاریخ کا کچھ تو مطالعہ کیا ہوتا، یہ میڈیا غیروں کا غلام ہے اور انھیں ہر وقت سپر پاور کے طور پر پیش کرنا اس میڈیا کا فرض اولین ہے۔ لیکن کاش آپ نے سچ کا شعور حاصل کرنے کی کچھ کوشش کی ہوتی۔ سچ کبھی چھپا نہیں رہتا۔ ابھی چند مہینے پہلے لندن کے سائنس میوزیم میں ہونے والی نمائش ہی دیکھی ہوتی۔ اس نمائش کی خبریں وائس آف امریکہ سے بھی نشر ہوئیں۔ عنوان تھا ایک ہزار ایک ایجادات اور مسلم ثقافت۔ آج کی ایجادات کی دنیا کی بنیاد تو مسلمانوں نے رکھ چھوڑی تھی اور بنیاد ہی تو مشکل ہوتی ہے۔ آج کی سائنسی دنیا مسلمانوں کے کئے گئے کاموں کی ہی مرہون منت ہے۔ یونیورسٹیاں، طبّی ایجادات، ہائی جین پمپس، واٹر وہیلز اس دنیا کو کس نے عطا کئے، جناب مسلمانوں نے۔ یہ سب نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ لندن کے سائنسی میوزیم میں ہونے والی نمائش بھی یہی اعلان کر رہی تھی۔ اگر ہم نے اپنے ہاتھوں اپنی تباہی نہ کی ہوتی تو آج ہمارے حالات کچھ اور ہی ہوتے۔ ایلیفنٹ کلاک ایک مسلم موجد، ریاضی داں اور انجینیر ال جزاری نے 13 ویں صدی میں

بنایا تھا۔ ریاضی اور الجبرا ہی کو لے دیکھ لیجئے اگر یہ ہندسے نہ ہوتے، یہ صفر اور ایک اور باقی ہندسے نہ ہوتے تو آج کی دنیا کیسی ہوتی، ٹیکنالوجی کے کیا حالات ہوتے۔ مسلمانوں کی بیمثال کوششیں تھیں۔ الظہروی، ابن خلدون، ابن ال نفیس، جلال الرین رومی، ناصر الدیں الطوسی، ابن البیطر، ابن رشد، الادریسی، ابو مروان ابن ظہر، ابو حمید الغزالی، عمر الخیام، ابو ریحان البیرونی، ابوالحسن المووردی، ابو علی حسن الحیثم، ابوالوفا محمد البزجانی، ابوالحسن علی، ابوالنصر الفارابی، محمد ابن زکریا الرازی، الفرغانی، ابو عبداللہ الباطانی، علی ابن ربان التاباری، تحابت ابن قرا، یعقوب ابن اسحٰق الکندی، محمد ابن موسی الخوارزمی، جابر ابن حیان ۔۔۔۔۔۔۔ چند نام لکھے ہیں، ان کے علاوہ اور کتنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی بدولت کیمسٹری، ارتھمیٹک، فزکس، میڈیکل سائنس، کیلیگرافی، جیو میٹری، فلاسفی، سوشیالوجی، ھسٹریو گرافی، جیو گرافی، ارتھ سائنس، سرجری، میڈیسن، آپتھمولوجی، ڈینٹل سائنس، ٹرگنومیٹری، آپٹکس، میٹریا میڈیکا، سیاسایات، عمرانیات، سائیکالوجی، اناٹمی، گائینا کالوجی، بچوں کے امراض کا علم، علم معاشیات، جیالوجی، ریاضی، الجبرا، نیوپلاٹنک فلاسفی، میڈیکنل پلانٹس، باٹنی، آپتھمولوجی اور دوسرے بہت سے علوم کی بنیاد، تحقیق، تجربات کا ایک نظام بن گیا تھا۔ نئی نئی دریافتیں کی گئیں، آنے والوں کیلئے بہت کچھ چھوڑ دیا گیا، اور کچھ نہیں تو حضرت کمال الدین دمیری اور حضرت امام قزوینی کی کئی سو سال پہلے لکھی بس دو کتابیں

حیاۃالحیوان اور عجائب المخلوقات ہی دیکھ لی ہوتیں، عقل دنگ رہ جاتی۔ سائنس اور جدید علوم میں، نت نئی تحقیق میں، پوشیدہ رازوں کو آشکار کرنے میں مسلمانوں کا اپنے پچھلوں کا مقام پتہ چلتا، اسلام کے سانچے میں ڈھلے لوگ کیسے جدید علوم کی بنیاد رکھ کر بڑھے چلے جا رہے تھے اور آنے والوں کیلئے کیسی راہنمائی تیار کر رہے تھے، آپ بھی جان جاتے۔ یہ سب اسلام کی بدولت تھا، اس تمام کا ماخذ اور وجہ اسلام بنا تھا، اسلام ترقی اور عروج کا دروازہ اور اس دروازے کو استعمال کرنے والوں کیلئے ترقی اور عروج کا ایک محفوظ راستہ اور اس راستے کی منزل بھی ہے۔ اسلام سائنس کا رہنما ہے۔ جو ذہن اپنے آپ کو مسلمان سوچتے اور کہتے ہیں لیکن ان کی پرورش اسلام کے عملی پرہیز میں ہوئی ہوتی ہے، وہ جن کو عورتوں کے چھوٹے ہوتے کپڑوں میں عورتوں کی ترقی نظر آتی ہے، جب وہ یہ کہتے ہیں تو میرے جیسے پوچھتے ہیں کہ کتنی ترقی کر لی کیا عورتیں چاند پر پہنچ گئی ہیں تو وہ ہنستے ہیں۔ یہ ہنستے تو ہیں لیکن یہ ہمارے اپنے ہی ہیں۔ ایسوں میں کچھ یقیناً ایسے بھی ہیں جو سوچیں گے اسلام اور سائنس؟ اور ان کو سمجھ نہیں آئے گی، قانون ہے کہ جس کو سمجھنا ہو تو سمجھ کیلئے علم بھی چاہئے ہوتا ہے، اور اسلام اور اسلامی علوم، اسلامی تاریخ سے جن کو پرہیز کروایا گیا وہ بھلا کیسے سمجھیں گے۔ ان کو کنفیوژن ضرور ہو گی۔ ان کی مدد کیلئے ایک مثال پیش کیا دیتا ہوں۔ عالمی شہرت یافتہ پروفیسر تیجاتات تجاسن چیانگ مائی یونیورسٹی آف تھائی لینڈ کے

شعبہ انا ٹمی کا چیئرمین اور اسی یونیورسٹی کا فیکلٹی آف میڈیسن کا سابقہ ڈین ایک میڈیکل کانفرس میں پہنچا۔ تو اسے ایمبریالوجی کے مشہور سائنسدان پروفیسر کیتھ مور کے لکھے لیکچر کو سننے کا موقع ملا۔ اس لیکچر کا موضوع تھا کہ قرآن اور سنت میں جدید ایمبریولوجی کے بارے میں راھنمائی۔ پروفیسر کیتھ مور دنیا کے جدید ایمبریولوجی کے عالمی شہرت یافتہ سائنسدانوں میں سے ایک تھا (قرآن و سنت سے راہنمائی حاصل کرتا تھا) پروفیسر تیجاتات تجاسن جو کہ خود ایک سائنسدان تھا، قرآن و سنت سے پہلی دفعہ واقف ہوا تھا ان ناموں سے، قرآن و سنت اور سائنس پر اس کو عجیب حیرت ہو رہی تھی۔ دیکھنے والے یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ حیرت خوشی کی ہے اور یہ خوشی یہ حیرت پروفیسر تیجاتات تجاسن کو کیا عطا کرنے والی ہے۔ ڈرماٹولوجی پروفیسر تیجاتات تجاسن کی اپنی فیلڈ تھی۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن نے قرآن و سنت کا نام تو سن لیا تھا، اب وہ واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن اپنی فیلڈ کا بادشاہ تھا، وہ یہاں آنے سے پہلے اپنی تحقیق کر چکا تھا۔ اس کی تحقیق تھی کہ انسان کو درد کا احساس جلد میں موجود ریسیپٹرز کی وجہ سے ہوتا ہے اگر کسی طرح سے جلد کو مکمل جلا دیا جائے تو درد کا احساس ختم ہو جائے گا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن اپنی اس تحقیق پر داد وصول کر چکا تھا۔ عالمی شہرت پا چکا تھا۔ سائنسی کانفرسوں میں رونق کی ایک وجہ وہ بھی ہوتا تھا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن قرآن و سنت کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا، مسلمانوں سے قرآن و

سنت کے بارے میں علم حاصل کرتا رہا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن قرآن پاک کی سورۃ النساء کی آیت 56 کے حضور جا پہنچا۔

ترجمہ آیت نمبر 56۔ جنہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا عنقریب ہم ان کو آگ میں داخل کریں گے جب کبھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کے سوا اور کھالیں انھیں بدل دیں گے کہ عذاب کا مزہ لیں بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔۔

پروفیسر تیجاتات تجاسن اس آیت کے ترجمے پر حیران رہ گیا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن نے قرآن پاک کا جو ترجمہ پڑھا تھا، اس ترجمے کو بھی مرماڈیوک پکتھل، جارج ایلن نے مل کر لکھا تھا اور یہ ترجمہ پانچواں ایڈیشن تھا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن نے تسلیم کیا کہ سال پہلے یہ آیات/پیغام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کسی انسان کی 1400 طرف سے بتانا یا پہنچانا ممکن نہ تھا۔ لیکن یہ بات، آیات/پیغام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو 1400 سال پہلے کس نے بتائیں۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن کو بتایا گیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ یہ علم/ پیغام 1400 سال پہلے اللہ (جلّ جلالہ) کی طرف سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا گیا ہے۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن حیران رہ گیا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن نے بے اختیار ہو کر پوچھا یہ اللہ کون ہے ؟ پروفیسر تیجاتات تجاسن کو بتایا گیا کہ اللہ وہ ہے جو تمام موجودات کا خالق ہے۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن کہ بتایا گیا کہ عقل کی بھی یہی گواہی ہے کہ یہ

کلام/علم اس (جلّ جلالہ) کی طرف سے ہے جو سب کچھ جانتا ہے۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن کو بتایا گیا کہ اگر وہ کائنات پر غور کرے تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ کائنات اس نے (جلّ جلالہ) بنائی ہے جو ایک ہے، سب کچھ جانتا ہے۔ ان تخلیقات پر غور کرے تو اسے محسوس ہو گا کہ یہ کسے ایک کی تخلیقات ہیں، جو سب کچھ جانتا ہے۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن نے یہ سب تسلیم کیا اور اس کے بعد پروفیسر تیجاتات تجاسن اپنے ملک واپس چلا گیا اور اس نے اپنے نئے علم اور دریافت (قرآن اور سنت) کے بارے میں لیکچر دینے شروع کر دئے۔ اس کے لیکچر سن کر کئی لوگ مسلمان ہو گئے۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن اگلی بار میڈیکل کانفرس میں پھر شریک ہوا اور اس دفعہ یہ عالمی شہرت یافتہ اور انعام یافتہ سائنسدان ہر مسلم اور غیر مسلم سے قرآن اور سنت کے بارے میں ہی گفتگو کرتا رہا۔ چار دن بعد پروفیسر تیجاتات تجاسن کھڑا ہو کر سب لوگوں سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ میں اپنے مشاھدات اور مطالعہ سے ایک نتیجے پر پہنچا ہوں، مجھے یقین ہے کہ 1400 سال پہلے قرآن پاک میں جو کچھ بھی بتایا گیا ہے، سب سچ ہے، اور جو کچھ بھی بتایا گیا ہے ہم اس کو تحقیق سے ثابت کر سکتے ہیں۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن بولتا ہی جا رہا تھا۔ پروفیسر تیجاتات تجاسن نے لوگوں کو بتایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری طور پر پڑھے لکھے نہیں تھے، وہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے پیغمبر ہیں جنہوں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ سب سچ ہم تک پہنچایا جو اس (جلّ جلالہ) کی طرف سے ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا کیا

گیا تھا، جو سب کا پیدا کرنے والا ہے اور سب کو پیدا کرنے والا اللہ (جلّ جلالہ) ہے، پروفیسر تیجاتات تجاسن نے سب کو گواہ بنایا، پھر پروفیسر تیجاتات تجاسن نے بلند آواز سے کلمہ پڑھا اور سب کو بتایا کہ اس کیلئے زندگی میں سب سے اہم یہ ہے کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا ہے اور وہ اب مسلمان ہے۔

تاریخ تو واقعات اور مثالوں سے بھری ہے لیکن یہ ایک منتخب واقعہ بھی ہم پر یہ حقیقت واضح کر رہا ہے کہ اسلام امام ہے سب کا اور ہر علم کا۔ جو اسلام سے وابستہ ہو جاتا ہے، اپنی ذات پر اسلام کی حکومت قرآن و حدیث کے مطابق قائم کرتا ہے، دنیا میں اس کو عظمت ملتی ہے۔، اس کی حکومت چلتی ہے۔ کم و بیش 1000 سال مسلمانوں نے دنیا پر حکومت کی، دنیاوی علوم کی ترقی اور تحقیق کے حوالے سے بیمثال کام کر دکھایا، یہ سب اسلام سے وابستگی کی برکتیں نہیں تو اور کیا ہے۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ جس نے اسلام کو جتنے شوق اور محبت سے اپنے پر طاری کیا، جدید سائنسی علوم بھی اتنے ہی اس پر آشکار ہو گئے۔ اس پر کائنات کے اسرار کھلتے ہی گئے، تو مناسب ہوگا۔ حیاۃالحیوان اور عجائب المخلوقات بھی اس کی زندہ مثالیں ہیں، یہ تقریباً 700 ہجری میں لکھی گئیں، آج 1431 ہجری ہے۔ 731 ہجری کی کتابیں اور ایسی اور بہت سی تحقیقات دیکھیائیں اور اس دور کے وسائل کو دیکھیں تو یہی یاد آتا ہے کہ "مومن اللہ" کے نور سے دیکھتا ہے۔" اسلام کو جتنا اپنائیں گے اتنا ہی آگے جائیں گے۔ محسن پاکستان

ڈاکٹر عبدالقدیر اسلام سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ اسلام کی مایہ ناز ہستیوں کے حالات کے بارے میں لکھی گئی کتاب "تذکرۃالاولیا" ان کی پسندیدہ کتاب ہے۔ ایٹم بم بنا کر ہی دم لیا۔ پڑھے لکھے مسلمان تو دنیا میں اور بھی بہت تھے لیکن اسلام سے محبت بھی تو ایک شرط ہے۔ "تذکرۃالاولیا" پڑھنے والا آج خود بھی عظیم ہے۔ اس کی عظمت کو پاکستانی تو کیا دوسرے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ میرے سامنے محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کے لیٹر پیڈ پر لکھی ڈاکٹر صاحب کی دستخط شدہ ایک تحریر ہے، جو ایک مہربان نے مطالعہ کیلئے دی ہے۔ یہ تحریر ڈاکٹر صاحب نے "ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل" کو عطا فرمائی تھی۔ یہ تحریر امام احمد رضا فاضل بریلوی کے بارے میں ہے۔ اس تحریر کا کچھ حصہ یہ ہے کہ امام احمد رضا فاضل بریلوی نے مسلمانوں کو دینی شعائر پر قائم رہنے کی تلقین کی اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف بھی راغب کیا اور ایسے تمام علوم کو سیکھنے پر زور دیا جو فکری اعتبار سے دین اسلام سے متصادم نہیں ہیں۔ مسلمانوں میں دینی اور دنیاوی علوم کے فروغ کیلئے امام احمد رضا فاضل بریلوی کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ یہی نکتہ تو ہمارا بھی موضوع ہے کہ اسلام سے محبت کرو، اسی دین پر قائم رہ کر دینی اور دنیاوی علوم حاصل کرو۔ دین اسلام سے محبت اور وابستگی جدید دنیاوی علوم کے راز جاننے کا ذریعہ بن جائے گی۔ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر نے امام احمد رضا فاضل بریلوی کے بارے میں سچ ہی کہا ہے۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی ایک سچے عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسلام کے پکے شیدائی تھے اور اسلام ہی کی برکت سے ان کو ہر فن پر، دنیاوی علوم پر دسترس حاصل تھی۔ علم توقیت میں اسقدر کمال حاصل تھا کہ دن کو سورج دیکھ کر اور رات کو ستارے دیکھ کر گھڑی ملا لیتے۔ وقت بالکل صحیح ہوتا، کبھی ایک منٹ کا بھی فرق نہ ہوا۔ علم ریاضی میں آپ یگانہ روزگار تھے، چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاالدین جو ریاضی میں غیر ملکی ڈگریاں اور تمغہ جات حاصل کئے ہوئے تھے۔ آپ کی خدمت میں ریاضی کا ایک مسئلہ پوچھنے آئے۔ ارشاد ہوافرمایئے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا مسئلہ نہیں کہ اتنی آسانی سے عرض کر دوں۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی نے فرمایا، کچھ تو فرمایئے۔ وائس چانسلر صاحب نے یہ سوال پیش کیا تو امام احمد رضا فاضل بریلوی نے اسی وقت اس مسئلے پر تشفی بخش جواب دے دیا۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگے کہ میں اس مسئلے کیلئے جرمنی جانا چاہتا تھا۔ یہ ریاضی کے ماہر ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ داڑھی رکھ لی اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی جو اعلیٰ حضرت کے لقب سے بھی جانے جاتے ہیں، علم تکسیر، علم ہئیت، علم جفر میں بھی ماہر تھے۔ جدید الجبرا کے ایک اہم مضمون ٹایالوجی پر امام احمد رضا فاضل بریلوی کو عبور حاصل تھا اور ہزار سے زیادہ

کتابوں کے مصنف ہیں۔ حاشیہ اصول طبعی، حاشیہ علم الہیت، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ حدائق النجوم، حاشیہ برہندی وغیرہ وہ حواشی ہیں جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی نے دوسروں کی تصانیف پر لکھے۔ البرٹ۔ ایف۔ پورٹا امریکہ کا مشہور میٹرولوجسٹ تھا، اس نے یہ پیشین گوئی کی کہ 17 دسمبر 1919ء کو سیاروں کے اجتماع اور کشش کے سبب دنیا میں زلزلے اور طوفان برپا ہوں گے۔ دنیا ایک قیامت صغریٰ سے دوچار ہو جائے گی، دنیا کے بعض علاقے نیست ونابود ہو جائیں گے۔ پورٹا کی اس پیشین گوئی سے امریکہ میں خوف پھیل گیا اور اس خوف نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ لیکن اسلام جن کا اوڑھنا بچھونا ہو اور جنہوں نے سائنس اور جدید علوم کو اسلام کی نظر سے جانا ہو، ان کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی نے ایک رسالہ " معین مبین بہر دور شمس وسکون زمین " 1338 ہجری مطابق عیسوی میں لکھ کر فلکیاتی علم ہی سے پورٹا کی پیشین گوئی کو غلط ثابت کر دیا۔ 1919 دنیا نے دیکھا کہ اسلام کے ماننے والے کا علم سچا ثابت ہوا۔ ان کی خصوصیت پر غور کیجئے، خصوصیت ہے قرآن وسنت کے سچے پیروکار اور ان کی سائنس پر گرفت دیکھئے۔ قرآن کی گواہی کے ساتھ گردش زمین کے نظریہ کو سائنسی علوم کے دلائل کیساتھ غلط ثابت کیا ہے، ثابت کیا ہے کہ زمین ساکن ہے اور امام احمد رضا کو یہ علم قرآن وسنت کے ذریعے ملا ہے۔ کبھی سائنس کو بھی یہاں پہنچنا ہی ہے۔ اسلام کے متوالے اور شیدائی امام احمد رضا فاضل بریلوی نے "فوز مبین" میں باقاعدہ نام لے کر

آئزک نیوٹن، کوہر نیکس، کیپلر، ہر شل، طوسی، بطلیموس کے نظریات کا رد اور ان کا علمی تعاقب کیا ہے، ابو ریحان البیرونی اور ارشمیدس کی تائید کی ہے۔ گلیلیو کے جمود اور کشش ثقل کے نظریات اور آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کا انہیں کے دلائل کی روشنی میں سائنسی رد کیا ہے اور تائید و حمایت حاصل کی ہے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی نے اسلام کو دل و جان سے اپنایا تھا اور یہ سب کچھ انہیں اسلام ہی کی بدولت ملا تھا۔ اس مضمون سے یہی سمجھنا سمجھانا مقصود ہے۔ ان علوم کو ان تحقیقات کو آگے بڑھانے کیلئے بھی اسلامی نظر، اسلامی سوچ اور اسلامی کردار کی ضرورت ہے، جو آج کے مسلمانوں نے کھو دیا ہے۔ اسلام کو اپنائیں لیکن دل و جان سے، اور دونوں جہانوں کی بھلائیاں اپنے دامن میں سمیٹتے جائیں اور یہ اسلام نام ہے قرآن و سنت کا۔

اسلام گھر سے لے کر حکومت تک ہر مسئلے کا حل ہے، انسان سے لے کر جانوروں اور پرندوں تک کیلئے رحمت ہے، نگہبان ہے، زندگی کے ہر موجودہ اور قیامت تک آنے والے ہر مسئلے کے بارے میں کامل راھنمائی کرتا ہے، یہ حل ہے ہر مسئلے کا، بھوک اور غربت کا، بدامنی کا اور یہ اسلام عمل کرنے والوں کیلئے آسان ہی آسان ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ بات بڑی عجیب ہے، کہ اب اسلام پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے۔ واہ، سب کچھ کرتے پھرتے ہیں لیکن اسلام پر عمل نہیں ہو سکتا۔

جناب، عمل کیوں نہیں ہو سکتا، کرنے والے اب بھی عمل پر قائم ہیں۔ تاریخ گواہ ہے عمل بھی ہوا ہے اور کئی سو سال ہوا ہے، وہ بھی انسان ہی تھے، ہم بھی انسان ہیں، بس وہ اسلام سے محبت کرتے تھے اور آج ہماری زبان پر اسلام، جبکہ ہماری ذہنی اور عملی محبت غیر اسلام سے وابستہ ہے۔ ہمت کیجئے، آج سے کوشش شروع کیجئے، اسلام کو اپنے پر نافذ کیجئے۔ آپ کا گھر اور معاشرہ خود بخود اسلامی ماحول میں ڈھلتے جائیں گے۔ یقین کیجئے آپ پر اور ہم تمام پر برکتوں کا نزول ہوگا۔ جیسے ہمارے اسلاف پر ہوا تھا۔

اسلامی اصولوں پر عمل رب کریم، مالکِ ذُوالجلال، پیارے اللہ کریم جلّ جلالہ کی رضا کیلئے کیجئے، ابھی سے کوشش کیجئے۔ ہمارے پیارے پیارے آقا کریم، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو سیکھئے، ان پر عمل کیجئے، اسلام پر عمل ہوتا جائے گا۔ برکتوں اور رحمتوں کا نزول شروع ہو جائے گا۔ نحوستوں سے جان چھوٹنا شروع ہو جائے گی۔

ہمارے پیارے پیارے آقا کریم، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں، زندگی گزارنے کے اسلامی قوانین میں بے شمار حکمتیں اور برکتیں ہیں۔

برکتوں سے بھرپور کچھ حکمتوں کی ایک جھلک آپ کیلئے۔ لیکن یہ ذہن میں رکھ کر

پڑھئے کہ ہمارے عمل کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمیں اللہ کریم جلّ جلالہ کی رضا کیلئے پیارے محبوب، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کرنا ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ دین، دین اسلام کے اصولوں کو اپنانا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہیں کہ اگر ہم ان صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی جان، مال، ماں باپ ،اولاد، بلکہ ہر شے سے زیادہ محبت نہ رکھیں تو ہم مسلمان نہیں ہو سکتے۔ سنتوں کی حکمتوں کے بارے میں جدید تحقیق ہو یا نہ ہو، ہم اس کے محتاج نہیں، ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں تو ہر صورت شوق اور خوشی کے ساتھ عمل کرنا ہی ہے، بالکل سیدھا راستہ ہے۔ آپ دیکھیں کہ جو عمل سنت کے ،اسلام کے خلاف ہے، اس میں ہمارے لئے نقصان ہی نقصان ہے۔ آج ماڈرن سائنس بھی اپنی حیثیت، مقام اور علم کے مطابق تحقیق کے بعد خلاف سنت اعمال، غیر اسلامی افعال کے نقصانات اور سنت پر عمل کرنے کے فائدے ہمارے سامنے لا رہی ہے اور یہ ہوتا ہی رہے گا۔ مسکرانا ہمارے پیارے پیارے آقا کریم، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور واشنگٹن کے ماہرین آج کی تحقیق پڑھئے۔

(یہ خبر انٹرنیٹ پر آن لائن پڑھنے کیلئے اس لنک کو استعمال کریں۔)

http://www.onlineurdu.com/?p=11142

ریسرچ۔واشنگٹن : بھرپور مسکراہٹ طویل عمری کا راز ہے۔ مسکراہٹ اور ہنسی نا صرف صحت مند زندگی کا باعث ہوتی ہے بلکہ طویل العمری کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ تفصیل کے مطابق امریکی ریاست مشی گن کے ماہرین نے ایک تحقیق میں انکشاف کیا ہے کہ کُھل کر مُسکرانا زندگی کے سالوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ماہرین کے مطابق دانت نکال کر ہنسنے سے آنکھوں کے گِرد پڑنے والی جھائیاں مثبت زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو لمبی عمر تک بہتر صحت کی ترجمانی ہے۔ 230 بیس بال کھلاڑیوں کی تصاویر، ان کی عمر، قد، وزن اور ازدواجی زندگی سے مرتب کیے گئے نتائج کے تحت خوشگوار اور مسکراہٹوں سے بھرپور زندگی گزارنے والے کھلاڑیوں کی زندگی میں عام کھلاڑیوں کی نسبت سات سال کا اضافہ دیکھا گیا۔اس تحقیق کے ذریعے ماہرین نے ثابت کیا کہ مسکراہٹ نا صرف صحتمند زندگی کا باعث ہوتی ہے بلکہ طویل العمری کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔

حدیث شریف::: '' اللہ تعالیٰ جلّ جلالہ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے اٹھانے والے پر اور اس شخص پر جس کے لئے اٹھا کر لے جائی '' گئی۔

بد قسمتی سے شراب پینا ہمارے معاشرے کا عام اور بہت سارے نام نہاد لوگوں کا

پسندیدہ عمل ہے۔ پروفیسر ھرش نے شراب کے نقصانات پر ایک پوری کتاب لکھی ہے۔
اے ایف پی کی ماسکو سے 5 جولائی 1958 کی خبر کے مطابق روس کے صدر خروشیف نے لینن گرڈ کے کارخانہ کروف میں مزدوروں کی مخاطب کرتے ہوئے کہا، شراب ہماری مجلسی زندگی میں تباہ کن اثرات پیدا کر رہی ہے۔اس نے مزدوروں کی صحت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ عائلی زندگی برباد کر دی ہے۔ جرائم کر رفتار تیز کر کے اقتصادی پیداوار کو خطرناک نقصان پہنچایا ہے۔ ہم اس کے خلاف جنگ لڑیں گے۔
حدیث شریف : '' جو نظروں کی حفاظت کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ایسا ایمان عطا فرمائے "" گا جس کی حلاوت وہ دل میں محسوس کرے گا۔
آج ہمارے معاشرے میں ہم غیر محرم عورتوں کو چاہے وہ ٹی وی پر ہوں یا ہمارے سامنے، ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں اور پھر کسی کی بہن اور بیٹی پر اپنے دوستوں میں بیٹھ کر تبصرے کرتے ہیں اور ہمیں یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم کوئی جرم کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن ڈیوڈ ایک پروفیسر ہے۔ اس نے اپنے تجربات بتائے ہیں، کہتا ہے کہ نگاہیں جس جگہ جاتی ہیں وہی جمتی ہیں پھر ان کا اچھا اور برا اثر اعصاب، دماغ، اور ہارمونز پر پڑتا ہے۔ بیوی، بہن اور ماں کے علاوہ کسی عورت کو دیکھنے سے ہارمونری سسٹم کے اندر خرابی میں نے

دیکھی ہے۔ کیونکہ ان نگاہوں کا اثر زہریلی رطوبت کا باعث بن جاتا ہے اور ہارمونری گلینڈز ایسی تیز، زہریلی رطوبتیں خارج کرتے ہیں جس سے تمام جسم درہم برہم ہو جاتا ہے۔

کھاتے پیتے وقت بیٹھ جانا سنت ہے۔ لیکن ہم بدقسمتی سے شادیوں وغیرہ پر کھڑے ہو کر کھاتے پیتے ہیں۔

ڈاکٹر بلین کیور اٹلی کا ڈاکٹر ہے اور یہ ماہر اغزیہ ہے اس کا کہنا ہے کہ کھڑے ہو کر غذا نہ کھاؤ۔ ایسا کرنے سے تم دل اور تلی کے مرض میں پھنس جاؤ گے۔ اس کا کہنا ہے کہ بیٹھ کر کھاؤ اور کم کھاؤ کیونکہ کھڑے ہو کر کھانا نفسیاتی امراض پیدا کرتا ہے۔

کھانے کے بعد پلیٹ صاف کرنا سنت ہے۔

جدید سائنس کہتی ہے کہ کھانے کی پلیٹ یا برتن کے پیندے میں وٹامنز اور خاص طور پر کھانے میں موجود وٹامن بی کمپلیکس اور ایسے غزائی اجزا ہوتے ہیں، جو تمام کھانے میں کم اور اس پیندے میں

زیادہ ہوتے ہیں۔ اغزیہ میں موجود معدنی نمکیات تو صرف پیندے ہی میں ہوتے ہیں۔

پانی دیکھ کر، بیٹھ کر، تین سانس میں پینا، کھلے برتن میں پینا سنت ہے اور احادیث میں پیالے (پینے کے برتن) میں سانس لینے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اگر پانی کھڑے ہو کر پیا جائے تو ماڈرن سائنس کہتی ہے کہ معدہ اور جگر کی بیماریاں پھیلتی ہیں اور پاؤں پر ورم کا خطرہ رہتا ہے اور اگر پاؤں پر ورم شروع ہو جائے تو جسم کے باقی حصوں پر بھی ورم کا خطرہ ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کر پانی پینے سے استسقاء کے مرض کا خطرہ ہے۔

اگر پانی تین سانسوں میں نہ پیا جائے اور ایک ہی گھونٹ میں پینے کی غلطی کی جائے تو معدے میں فوراً زیادہ مقدار میں پانی جانے سے اس کی کی سطحی اندرونی کیفیت میں انبساط یعنی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ اگر یہ پھیلاؤ اوپر کی سطح پر ہو تو دل اور پھیپھڑوں کو نقصان کا خطرہ رہتا ہے۔ اگر یہ دائیں طرف ہو تو جگر کو نقصان پہنچاتا ہے اور اگر یہ بائیں طرف ہو تو تلی کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر یہ نیچے ہو تو آنتوں پر دباؤ پڑتا ہے۔

اگر پانی پیتے وقت پانی ہی میں سانس لینے کی غلطی کی جائے تو خطرہ ہے کہ پانی ناک کی نالیوں میں چلا جائے اور ورم کا باعث بنے یا سانس کی نالی میں جا کر گھٹن کا باعث بنے اور اس کے علاوہ یہ کہ انسان سانس لیتے وقت آکسیجن

لیتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتا ہے، اندر سے خارج ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ میں بے شمار جراثیم ہوتے ہیں۔ پانی میں سانس لینے سے یہ جراثیم بھی پانی میں شامل ہو جائیں گے۔

ہمارے پیارے پیارے آقا کریم، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دائیں جانب رو بقبلہ ہو کر آرام فرماتے تھے۔

جدید میڈیکل ریسرچ کے مطابق اس سنت پر عمل نہ کرنے سے بھی انسان کو کئی قسم کے نقصانات کا خطرہ ہے۔ کیونکہ دل بائیں جانب ہوتا ہے اور اگر ہم بائیں یعنی الٹی جانب لیٹیں گے تو کیونکہ ہمارا دل الٹی جانب ہوتا ہے لہٰذا معدہ اور آنتوں کا بوجھ دل پر پڑتا ہے جس کی وجہ سے دوران خون میں کمی پیدا ہو جاتی ہے اور انسان کے دل اور معدے کی بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

نوٹ : جب سو کر اٹھیں تو اس وقت بھی سیدھی کروٹ لے کر اٹھنا انسانی جسم کو نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

اسلام میں عصر کے وقت کے بعد سے عشا تک سونے سے منع کیا گیا ہے۔

جدید تحقیق بتا رہی ہے کہ عصر کے بعد زمین کی گردش محوری اور گردش طولانی کے کم ہونے سے ایک خاص قسم کی گیس نکلتی ہے جس سے آدمی کے دل و دماغ پر ایک بوجھ اور وزن پڑتا ہے اگر یہی آدمی عصر سے عشا کے اوقات کے دوران سو جائے تو اس گیس کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے یہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی سمجھنا چاہے تو اتنا بھی کافی ہے۔

ارشاد قرآن سورہ الاحزاب۔آیت 21

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنتہ ۔۔۔ بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے۔

آیئے خرابیوں کو چھوڑ کر بہتری کی طرف چلتے ہیں۔ مسلمان کی نیت کو اس کے عمل سے بہتر فرمایا گیا ہے۔ نیت ہو گی تو تبھی باقی معاملات چلیں گے۔ آپ ابھی فوراً نیت کر لیجئے کہ آج ابھی سے اللہ تعالیٰ جلّ جلالہ کی رضا کیلئے، پیارے آقا کریم، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا اور اپنی تعلیم، اپنا روزگار، اپنے تمام معاملات اسلام کے تابع کروں گا۔ انشاء اللہ جلّ جلالہ۔

میری طرف سے ایسی پیاری نیت کرنے پر، ہمت کرنے پر، بہتریوں کے آغاز پر مبارکباد قبول کریں۔ اللہ کریم جلّ جلالہ آپ کو اور مجھے استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

موت آئی اور وہ مَر گیا لیکن؟

نہ کوئی ڈرامہ ہے نہ جھوٹ نہ فلم کی کہانی اور نہ تحریر کی شعبدہ بازیاں، بات سچی ہے اور وہ یہ ہے کہ لاھور شہر میں اقبال ٹاؤن کے ھما بلاک کے ایک کونے پر، انسانوں کے گھروں کے بالکل سامنے مین روڈ ہے، بالکل وہاں پر جہاں روز افطار مارکیٹ لگتی ہے اور اتوار کو اتوار بازار لگتا ہے، بالکل وہیں پر وہ تین دن بیٹھا رہا سر اٹھا کر دیکھتا رہا، اٹھ نہیں سکتا تھا اور بھوکا پیاسا لیٹنا ممکن نہیں تھا، سر اٹھا کر آنے جانے والوں کو اور گھروں کے مکینوں کو دیکھتا رہا کہ شاید کوئی اس کی مدد کر دے لیکن ان لوگوں میں اتنا رحم دل انسان کوئی نہ تھا۔ وہ اکیلا تھا انسانوں کی بھیڑ میں سر اٹھا اٹھا کر تھک گیا۔ تین دن کی بھوک پیاس کے بعد سر اٹھانے کی ہمت بھی نہ رہی۔ جسم تو پہلے ہی زمین پر تھا سر بھی جسم کے ساتھ جا لگا۔ بیچارہ بیمار تھا اور اکیلا، وہ ڈھے گیا۔ زمین کے ساتھ منہ لگا کر موت کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے نیچے کیچڑ تھا اور اس کے جسم پر کیڑے چلنے لگے۔ ابھی تک ایک بھی ایسا انسان نہیں نظر آیا تھا جس کی انسانیت اسے اس بیچارے کی طرف توجہ دلاتی۔ چار دن گزر گئے، موت کا انتظار کرتے مریض کے پاس ایک گاڑی رکی۔ کسی انسان کی انسانیت کسی کو اس کے پاس کھینچ لائی تھی، کوئی گاڑی سے اترا، اسے ہلا جلا کر دیکھا اور وہیں بیٹھ

گیا۔ یہ بیٹھنے والا سارا دن آفس میں کام کرکے آیا تھا، افطاری کا وقت تھا، گھر قریب تھا لیکن مریض کی حالت نے اس کو سوچوں میں انتشار پیدا کر دیا تھا، اس کے دماغ میں بس یہی تھا کہ اس مرتے مریض کیلئے کیا کروں۔ اس کی سوچ نے اس کے دماغ میں ہمدردی اور مسیحائی کے بادل بنا دئے تھے اور چار دن کے لاچار پر چھما چھم ہمدردی کی بارش برسنے لگی تھی اور کچھ ھی دیر بعد وہ اپنے دوست کے ساتھ اس مریض کو ہسپتال لے کر جا رہا تھا۔ ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر تھے لیکن دوائیاں نہ تھیں۔ پرس کا منہ کھلا دوائیاں بھی آ گئیں اور ڈاکٹر مریض کے ساتھ جُت گئے۔ یہ سلسلہ چار دن تک چلتا رہا۔ یہ تیماردار جب آفس سے ہسپتال پہنچتا تو مریض کی آنکھیں اسے ہی تکتی رہتیں اور وہ آنکھوں ہی سے شکریہ ادا کرتا رہتا۔ اس تیماردار نے مریض کیلئے ایک اور تیماردار بھی مقرر کر دیا تھا جو چوبیں گھنٹے اس کے ساتھ رہتا تھا۔ مریض کی حالت سنبھلنے لگی لیکن چار دن بعد مریض کی حالت اچانک خراب ہوئی اور مریض نے دم توڑ دیا۔ مریض تو مر گیا لیکن ان لوگوں کی انسانیت جن کے گھروں کے سامنے یہ کئی دن بھوکا پیاسا پڑا رہا تھا ان کی انسانیت تو اس مریض سے بہت پہلے کی دم توڑ چکی تھی۔ اس مریض کا علاج کروانے والے آپس میں سر جوڑ کر نم آنکھوں کے ساتھ اپنا دکھ بانٹتے رہے۔ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ ہم پہلے ہی کیوں نہ پہنچ گئے۔۔ یہ ان کی سوچ تھی یہ سوچ ہی ہوتی ہے جو ایک انسان کو درندہ بنا دیتی ہے یا انسانیت کے اعلیٰ مقاموں کوئی بھی درجہ حاصل کروا

دیتی ہے۔ اس مرنے والے مریض کا تیماردار مجھے بتا رہا تھا کہ جب وہ اس مرتے مریض کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تو پاس سے گزرتے بندوں کو مدد کیلئے پکارا لیکن انھوں نے یہ کہہ کر مدد سے انکار کر دیا کہ وہ نماز پڑھنے جا رہے ہیں اور لہٰذا اس نے اپنے دوست کو فون کیا وہ کافی دور سے آئے تو وہ دونوں اس مریض کا اٹھا کر ہسپتال لے جا سکے۔ ہسپتال میں ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ اس مریض کو کہیں بخار ہوا تھا، بھوک پیاس نے اس میں بے پناہ کمزوری پیدا کر دی تھی۔ اگر اس بھوکے پیاسے مریض کے سامنے واقع گھروں میں سے کوئی اچھی سوچ والا انسان اس مریض پر توجہ کرتا تو یہ مریض بچ سکتا تھا۔ لیکن یہ توجہ کسی نی کی تھی کیونکہ ہم لوگ اچھی سوچ کے قحط کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب تو عوام بھی کرپٹ سیاستدانوں کی طرح بے حس بنتی جا رہی ہے۔ اس موقعے پر حضرت میاں میر لاہوری علیہ الرحمتہ کا ایک مبارک قول میرے سامنے آ گیا۔

زیادہ روزے اور نمازیں ادا کرنے کا نام درویشی نہیں ہے، نماز روزہ اور شب بیداری یہ بندگی کے اسباب ہیں، درویشی تو لوگوں کو خوش کرنے کا نام ہے اگر تو حاصل کر لے گا تو واصل ہو جائے گا۔" مجھے دور رسالت ﷺ کا ایک واقعہ بھی یاد آ رہا ہے، تاجدار مدینہ، سرور قلب و سینہ، حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لشکر کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے اور راستے میں ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی، آپ ﷺ نے حکم دیا اور پورے لشکر نے اپنے راستہ بدل لیا تاکہ لشکر کی ہیبت سے کہیں کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلانا نہ چھوڑ دے۔

۔۔۔۔۔۔یہ اسلام ہے۔ صرف انسان نہیں، جانور پرندے بھی مسلمانوں کی شفقت اور مہربانی کے حقدار ہیں۔ ان کے ساتھ رحم اور مہربانی پر اجر اور ان کے ساتھ زیادتی پر بھی سزا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک فاحشہ عورت نے ایک پیاس سے جاں بلب کتے کو دیکھا تو کنوئیں سے اپنے جوتے میں پانی نکال نکال کر کتے کو پلایا اور خدائے احکام الحکمین (جل جلالہ) نے اس کی بخشش کر دی۔ انسانوں سے جانوروں اور پرندوں سے سب پر رحم کرنا ایک لازمی اسلامی اصول ہے حکم ہے لیکن اس معاشرے کی اکثریت اسلام سے دور جا چکی ہے۔ اکثر کا اسلام نماز روزے اور تلاوت تک محدود ہے۔ وہ مریض مر گیا لیکن جہاں پڑا تھا اس جگہ کے سامنے کے گھروں میں رہنے والوں کی مسلمانی سے پردہ بھی اٹھا گیا۔ ایک مسلمان بے مثال انسان ہوتا ہے لیکن آج کے اکثر مسلمان صرف نمازی ہیں یا پھر روزہ دار اور آگے اونچی دیوار۔ جانے وہ لوگ اس مریض کو دیکھ کر اپنی آنکھیں چرا کر کس اصول کی پیروی کر رہے تھے۔

یہ مریض ایک گدھا تھا لیکن یہ گدھا بھی ایک مخلوق تھا اس کتیا جیسا جسے دیکھ کر رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لشکر نے راستہ بدل لیا تھا۔

یہ گدھا، سامنے کے گھروں کے افراد، گدھے کو اٹھانے میں مدد دینے سے انکار

کرنے والے نمازی، اور گدھے کی مدد کیلئے راہ چلتے ایک انسان کا رکنا اور اس کی مدد کیلئے دور سے ایک اور شخص کا آنا۔ یہ سبھی اس معاشرے کے کردار ہیں۔ وہ لوگ بھی اسی معاشرے میں ہیں جن کا کردار آج کے کرپٹ سیاستدانوں اور بے رحم سرمایہ داروں جیسا ہوتا جا رہا ہے۔ ان سب کرداروں میں ایک نمایاں فرق سوچ کا ہے، کسی کی سوچ اسے رحم دل بنا دیتی ہے اور کسی کی سوچ اسے درندہ بنا دیتی ہے۔ ہم سوچوں کے قحط میں مبتلا ہو چکے ہیں اور جن کے سامنے وہ گدھا، ایک مخلوق زندگی موت کی جنگ لڑتا رہا وہ سوچوں کے اس قحط کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ ہمارے معاشرے کا داغ ہیں ایک ایسا داغ جو بالکل بدعنوان اور ظالم سیاستدانوں جیسا ہے اور ان جیسے دوسرے بھی۔ میں اپنی طرف سے اور ہماری ویب فیملی کی جانب سے ان دو تیمارداروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ آپ نے اس گدھے کے سامنے پاکستانیوں کی لاج رکھ لی۔ گدھا مر گیا لیکن یہ بات یہ کہانی بہت آگے جائے گی۔ اس کے آگے جانے کی وجہ مجھے ایک ایسی شخصیت کے واقعے سے پتہ چلتی ہے جو اپنی رحم دلی اور زندگی کی کامیابیوں اور زندگی کے عروج کے حوالے سے بے مثال ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے بتایا کہ بچپن میں انھوں نے ایک دفعہ ایک گدھے کو دیکھا جس کے خارش کی بیماری تھی اور وہ تکلیف سے بے چین ہو کر بار بار زمین پر گر کر زمین سے اپنا جسم رگڑتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی خارش اور پھر زمین پر جسم رگڑنے کی تکلیف دیکھ کر مجھے خود کو بڑی تکلیف ہوئی، میں بھاگ کر گھر

گیا اور ایک گدا لا کر گدھے کے پاس نیچے زمین پر رکھ دیا، چنانچہ اب کی بار جب گدھا زمین پر گرا تو اسے کے نیچے گدا تھا۔ اسے آرام ملا تو اس نے میری طرف دیکھا اور اس کی نگاھوں میں اطمینان تھا اور یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ میرا شکریہ ادا کر رھا تھا۔ بس اس دن سے لے کر آج تک مجھے دنیا میں ہر دن عروج ہی ملتا جا رہا ہے۔ انھوں نے بتایا ان جانوروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں تو یہ دعا دیتے ہیں، ان کی دعائیں لینی چاہئیں۔ یہ اسلامی بات ہے اسلام کا اصول ہے۔ لیکن جو لوگ کسی انسان یا جانور کو گدھے کی تکلیف کو صرف ایک تماشا سمجھ کر دیکھتے ہیں، ان کی بے رحمانہ سوچ ان کو کہاں لے جائے گی؟ اس بات کو ہم سب کو اور ان کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اچھی سوچ بھی واقعی ایک انمول دولت ہے، یہ شیطان فرشتوں کا سردار تھا حالانکہ یہ ایک جن تھا، عبادت گزار تھا لیکن اس کی سوچ میں خباثت آ گئی اور اسی سوچ کی وجہ سے مردود قرار پایا، اسے رسوا ہونا پڑا اور اس کی عبادت کسی کام نہ آئی۔ وہ لوگ جن کی سوچیں انھیں کسی مرتے جانور یا تکلیف میں مبتلا انسان کو دیکھ کر ان میں ہمدردی کے جذبات پیدا نہیں کرتیں انھیں سوچ لینا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر بھی کوئی پریشانی آئے اور ان جیسی سوچ والے لوگ ان کی مدد کرنے کی بجائے انھیں ایک تماشا سمجھ کر اپنی نماز پڑھنے چلے جائیں۔ آیئے ہم بھی اپنی اپنی سوچوں کا جائزہ لیں اور اگر ہماری سوچ

میں ذرا سی بھی خرابی ہے تو اسلامی ہدایات کی روشنی میں اسے درست کر لیں۔
فوراً۔۔۔ رحم کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

مجھے اس تیماردار نے بتایا ہے کہ وہ پہلے ہی سے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک فلاحی تنظیم چلا رہا ہے جس کے تحت جھونپڑیوں میں رہنے والوں اور غریب بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اور ان کیلئے سردیوں میں گرم کپڑوں اور جوتیوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بوڑھے لوگوں کیلئے اولڈ ہوم کیلئے جگہ بھی لی جا چکی ہے اور اب اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے جانوروں کے حقوق کے تحفظ کیلئے اور ان کی فلاح و بہبود کیلئے بھی کوشش ہو گی۔ فوری طور پر اس نے اپنے ڈونروں سے بات کی ہے اور دوائیوں سے محروم ہسپتال کی ایمرجینسی میں جانوروں اور پرندوں کیلئے دوائیوں کی مستقل فراہمی کا انتظام کر رہا ہے اور ڈاکٹروں کے تعاون سے لاھور میں بیمار جانوروں کیلئے مختلف جگہوں پر کیمپ لگانے کا آغاز جلد ہی ہو جائے گا۔ سیلاب کے حوالے سے کوششیں جاری ہیں۔ اس کی تنظیم کا ویب سائیٹ ایڈریس ہے۔

http://www.nazfoundationonline.org

ہمارے ملک میں دکھی انسانیت کے ساتھ جانوروں پرندوں کے حقوق کیلئے کام کرنے

کی بہت ضرورت ہے، جو بھی یہ کام کر رہے ہیں اور کریں گے ان سب کیلئے دعا ہے کہ آپ کو ایمان و عافیت نصیب ہو کہ یہ رحم دلی ایمان ہی کا ایک جز ہے، آپ کو خوشحالیاں نصیب ہوں اور آپ یونہی بڑھ چڑھ کر خلوص نیت کے ساتھ مخلوق کی خدمت کرتے رہیں اور اس مخلوق میں انسانوں کے ساتھ جانور اور پرندے بھی شامل ہیں۔ میری ہماری ویب کے قارئین سے گزارش ہے کہ آپ ریمارکس میں اس دعا پر آمین لکھ کر کہیں، جب زیادہ آمین اکٹھے ہو جائیں گے تو میں ان دو تیمارداروں کو ہماری ویب کی طرف سے یہ دعا اور آمین تحفے کے طور پر پیش کروں گا، گدھے کو خوش کرنے والے دو انسانوں کیلئے یہ بہترین تحفہ ہو گا۔

ذھنی مقابلے، خاوند اور بیوی

چالاک اور مکار لوگ جب بھی کسی کو دھوکہ دینا چاھتے ھیں، کوئی فریب کرنا چاہتے ھیں تو وہ اپنے شکار کو ذھنی طور پر ھرانے کی کوشش کرتے ھیں کبھی چینی سے زیادہ میٹھے ھو کر وار کرتے ھیں اور اسی مٹھاس کے سہارے دھوکہ دینے کیلئے رعب بھی ڈالتے ھیں اور جب کوئی کسی سے ذھنی طور پر دب جاتا ھے یا دھوکہ کھا جاتا ھے ،اعتبار کر بیٹھتا ھے، بلکہ قابو آ جاتا ھے تو وہ اس ٹھگ کے مقابلے میں اپنا اعتماد کھو بیٹھتا ھے اور جب کوئی شخص اپنا ذھن استعمال کرنے کی بجائے مکمل طور پر کسی ٹھگ کی سوچوں پر انحصار کرنے لگتا ھے تو وہ اس کے اشاروں پر ناچتا چلا جاتا ھے۔ مجھے اس کا کچھ اندازہ تھا اور پھر بے شمار مشاہدات نے اس اندازے کو یقین میں بدل دیا۔ یہ سلسلہ نہایت عجیب ھے لیکن عام ھو چکا ھے۔ کچھ سال پہلے کی بات ھے کہ آفس کی ایک لڑکی لنچ ٹائم میں روزانہ دلاور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتی اور دونوں غائب ھو جاتے۔ پہلے وہ وقت پر واپس آ جاتے لیکن پھر اکثر وہ لیٹ ھونے لگے۔ دلاور کے انچارج نے مجھے شکایت کی تھی۔ میں نے دلاور کو بلایا۔ دلاور نے مجھے بتایا کہ سر ھم آفس سے باہر جو مرضی کریں کوئی ھمیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے دلاور کو بتایا کہ صرف اسی لئے اسے کبھی کچھ نہیں کہا گیا لیکن ان دونوں کا لنچ ٹائم کے بعد روزانہ دیر سے آنا قبول نہیں ھے۔ دلاور

نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ وجوہات کی بنا پر وہ میری بہت عزت کرتا تھا اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن اگلے تین دن تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے دلاور اور مس ۔۔۔۔۔۔ کو بلایا اور ابھی میری ڈانٹ وسط تک ھی پہنچی تھی کہ لڑکی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں نے اپنی ڈانٹ کو موخر کیا اور معاملے کی تہہ میں گھس گیا۔ دلاور نے آفس کی ایک اور لڑکی اور دوسری کئی لڑکیوں کے ساتھ تعلقات استوار کر رکھے تھے اور یہ اس لڑکی کے علم میں آ گیا تھا جو محبت کے فریب پر اپنا سب کچھ دلاور کو سونپ بیٹھی تھی، لنچ پر آپس کی لڑائی کی وجہ سے دونوں لیٹ ھو جاتے تھے۔ میں نے ان کو آفس کی ضروری کاروائی، آخری وارننگ اور ایک زبردست اخلاقی لیکچر دے کر فارغ کر دیا۔ کچھ عرصے بعد میں اپنے پاؤں پر چوٹ کے نتیجے میں بستر پر جا پڑا۔ میری بیماری سالوں پر محیط ھو گئی، تو میں نے استعفیٰ دے دیا۔ آھستہ آھستہ آفس کے سٹاف سے رابطہ ختم ھوتا گیا لیکن ایک دن دلاور میری خبر لینے آیا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ میرا اخلاقی لیکچر دلاور کے دل پر چوٹ کر گیا تھا۔ دلاور اسی لڑکی کے ساتھ شادی کا کارڈ دینے آیا تھا۔ دلاور نے مجھے بتایا کہ کمزور اور احمق لڑکیاں بہت جلد اپنا دماغ اس کے حوالے کر بیٹھتی تھیں اور وہ ان سے بس دماغی کھیل کھیلتا رھتا تھا۔ لیکن اب ایسا کچھ نہیں ھے۔ آپ یقین کریں اور میں سوچتا رھا کہ مجھے دلاور کی بات پر یقین کرنا چاھئے یا نہیں۔ ماضی کا دلاور اور ماضی کے دلاور جیسے لوگ بس ذھنی کھیل ھی

تو کھیلتے ھیں اور اپنی ذھنی مکاری سے اور لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو برباد کر دیتے ھیں۔ دوسروں کو ذھنی شکست سے دوچار کرکے اپنا مطلب نکالنا ھمارے معاشرے کی اکثریت کا نہیں تو کم از کم آدھے معاشرے کا ایک رواج بن چکا ھے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک بڑی عجیب بات بتائی، اس کے بھائی کی دوکان میں ایک لڑکی آتی اور اسے کہتی کہ جتنے پیسے ھیں مجھے دے دو ورنہ میں شور مچادوں گی کہ تم نے میری عزت پر ھاتھ ڈالا ھے اور وہ ساری رقم اس کو پکڑا دیتا اور اپنی عزت کے ڈر سے کسی کو کچھ نہ بتاتا۔ جب لڑکی نے دیکھا کہ موصوف بڑی اچھی طرح سے اس کے جال میں پھنس چکے ھیں اور ذھنی طور پر شکست مان چکے ھیں تو اس نے بار بار آنا شروع کر دیا لہٰذا موصوف دوکان چھوڑنے کے چکر میں تھے۔ ایک دن میں دوکان کے کاؤنٹر کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ جیسے ھی لڑکی نے آ کر پیسے مانگے، میں باھر نکلا تو میرے ایک ھی تھپڑ کے بعد اس نے اپنی حقیقت بک دی۔ یہ تین چار لڑکے لڑکیوں کا ایک گروپ تھا جو مختلف جگہوں پر جا کر ایسے بھلکڑ قسم کے مرد حضرات کو تاکتے اور ان کے اشارے پر ان کی ساتھی لڑکیاں اپنی عزت پر ھاتھ ڈالنے کی دھمکی دے کر جیبیں خالی کروا کر رفو چکر ھو جاتی۔ بھولے بھالے لوگوں نے ان کا حوصلہ بہت بڑھا دیا تھا۔ اپنے آپ کو بڑا ھوشیار سمجھنے والے اور دوسروں کو نیچے لگا رکھنے کے خبط

میں مبتلا لوگ کسی کو پہلے سلام کرنے سے بھی کتراتے ھیں ان کا خیالِ غلط ھے کہ اسطرح ان کی شان کم ھو جائے گی اور وہ اگلے کے نیچے لگ جائیں گے۔ کچھ کاروباری لوگ دوسروں کو نیچے لگا کر رکھنے کے مرض میں اسطرح سے مبتلا ھیں کہ اگر وہ کسی کو زکوۃ بھی دیں تو اسے نیچے لگانے کے بعد یعنی ذھنی طور پر زِچ کرنے کے بعد دیتے ھیں اور زکوۃ لینے والا باھر نکل کر لوگوں کو بتاتا ھے کہ اس نے زکوۃ تو دی ھے لیکن ذلیل کرکے، اور اگر زکوۃ لینے والا ان پڑھ ھو تو ایک آدھ گالی بھی نکال دیتا ھے۔ میں نے ایک فیکٹری کے مالک کو اپنی ضمانت پر ایک پریس سے ادھار کروا دیا۔ مقررہ وقت کے کافی دیر بعد پریس والے نے مجھے شکایت کی کہ فیکٹری والے صاحب ادھار چکانے سے گریزاں ھیں۔ میں نے فوراً فیکٹری کے مالک سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ چیک تیار ھے لیکن کچھ دن بعد دوں گا، اپنا ھاتھ اوپر رکھنا ضروری ھے اور اس کے نزدیک ھاتھ اوپر رکھنے کا مطلب دوسرے کو ذھنی طور پر زِچ کرنا یعنی نیچے لگانا تھا، اس کے خیال بد میں اسطرح کرنے سے اسے آئندہ اپنے مطالبات منوانے میں آسانی ھونی تھی۔ ذھنی مکاریوں یا سازشوں کا رواج عام تو ھے لیکن یہ رواج سب سے زیادہ ان عورتوں میں نظر آتا ھے جو اپنی بیٹی کا بیاہ کرتی ھیں۔ ساری ساسیں اور عورتیں یقیناً ایسی نہیں ھیں لیکن ایک مچھلی تو ساری تالاب کو گندا کر ھی دیتی ھے اور یہاں تو ایسی مچھلیوں کی تعداد کافی زیادہ ھے، جو اپنے داماد کو نیچے لگانے کے شوق میں اپنے اور داماد کے گھر والوں کی زندگی میں ایک آگ

لگا بیٹھتی ھیں اور نتیجتاً سب سے زیادہ نزلہ ان مرد حضرات پر ھی گرتا ھے جن کے سر پر نزلے سے پہلے سہرا سجا ھوتا ھے۔ اکثر نوبت طلاق تک بھی جا پہنچتی ھے اور پھر لڑکی کی ماں لوگوں کو کہتی پھرتی ھے کہ لڑکا شادی کے قابل نہیں تھا اور لوگ یہ سن کر ھنستے ھیں کہ طلاق شادی کے ایک سال بعد ھو رھی ھے تو ایک سال لڑکا شادی کے قابل کیسے بنا رھا۔ آجکل کی شادی (ساری نہیں لیکن اکثر) ایک ایسا محاذ بن چکی ھے جس پر دولھا میاں کو ایک وقت میں کئی لڑائیاں لڑنی پڑتی ھیں۔ اسے کما کر لانا ھوتا ھے۔ بچوں کی تعلیم کے ساتھ بہت سارے دوسرے اخراجات کا بندوبست کرنا ھوتا ھے۔ اگر اس کی ساس ذھنی مقابلوں (ذھنی مکاری) کے عارضے میں مبتلا ھو تو اس کی بیوی اپنی ماں کے کہنے پر ھر وقت خاوند کو نیچے لگانے کے چکر میں نت نئے وار کر کے اس مرد کی زندگی میں مشکلات اور بے سکونی کے پہاڑ کھڑے کر دیتی ھے۔ اور اگر وہ مرد یا خاوند شکست قبول کر کے ذھنی غلام بن جائے یا اپنے حمایتیوں کے ساتھ دفاع یا مقابلے پر اتر آئے تو دونوں صورتوں میں گھر کا سکون رخصت ھو جاتا ھے اور سب سے زیادہ نقصان مرد صاحب کا ھی ھوتا ھے۔ کچھ دولھا حضرات یا ان کی ماؤں کی طرف سے ظلم و ستم کا مظاھرہ بھی ھمارے معاشرے کا ایک مقبول رواج ھے، جس کی اکثر وجہ لالچ دیکھی گئی ھے لیکن یہ میرا اس وقت کا موضوع نہیں ھے۔ یہ ذھنی مقابلے اکثر لڑکی کی ماں کی طرف سے شروع ھوتے ھیں اور لڑکی (دولھن) کے اپنی ماں کی ھدایات پر عمل کرنے کے سبب ایک ایسی آگ لگتی ھے، جس میں لڑکی کے

سارے گھر والے اور لڑکے کے حمایتیوں کو بھی کودنا ھی پڑتا ھے اور ان میں سے کسی کو اس بات کا اندازہ نہیں ھو پاتا کہ یہ ساری آگ لڑکی کی ماں نے اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر خود لگائی ھوتی ھے۔ آج تک صرف ایک لڑکی ایسی دیکھی جس کی گھر میں جب پہلی دفعہ اپنی ساس کے ساتھ ذرا ان بن ھوئی، لڑکی کی والدہ نے اپنا مشورہ پیش کیا، بھائیوں نے غصہ دکھانے کی کوشش کی۔ لیکن لڑکی نے سب کو چپ کروا دیا۔ لڑکی کا کہنا تھا کہ جب اِس گھر میں تھی تو ھم اپنے مسئلے آپس میں ھی حل کرتے تھے۔ ماں باپ سے کئی دفعہ ڈانٹ پڑی لیکن ماں باپ آج بھی ماں باپ ھی ھیں۔ اب میرے خاوند کا گھر میرا گھر ھے۔ ساس کا سلوک بیٹی بن کر برداشت کروں گی اور بعد میں بھی بیٹی بن کر ھی رھوں گی۔ آپ لوگ مداخلت نہ کریں۔ آج وہ لڑکی اپنے گھر میں خوش و خرم ھے اور صحیح معنوں میں ساس کی آنکھوں کا تارا بن چکی ھے، اگر وہ اپنی ماں اور بھائیوں کے پیچھے لگ جاتی تو آج ساس کی آنکھوں کے تارے کی بجائے ساس کے ساتھ ساتھ اپنے خاوند کے نزدیک ایک کانٹے کی حیثیت رکھتی ھوتی۔ کتنی ایسی ھیں کہ ایسی سوچ جن کے قریب سے بھی نہیں گزری اور ان کو اپنی شادی کی خوشیاں بھی کم ھی نصیب ھوتی ھیں۔ وہ خاوند بیچارے کہلانے کے بڑے حقدار ھیں جو ان ذھنی مقابلوں کی آگاھی نہیں رکھتے اور ساری زندگی گھُل گھُل کر گزار دیتے ھیں۔ دن رات شکست کھانے سے بہتر ھے کہ اس مقابلے کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر ختم نہ ھو سکے تو طلاق کے ذریعے ھی یہ مقابلہ ختم کر دیا جائے۔ اس ذھنی مقابلے کے کئی

انداز ھیں۔ مثلاً اگر کسی شادی پر لڑکی والے اپنے مرضی کا حق مہر رکھنے کی کوشش کریں جو کہ لڑکے کی آمدن سے بہت زیادہ ھوتا ھے تو یہ ایک ایسے ذھنی مقابلے کے آغاز کا الارم ھوتا ھے جس میں لڑکی کی ساری فیملی شریک ھوتی ھے۔ ایسا اکثر اس صورت میں کیا جاتا ھے جب لڑکی والے ذھنی (مکاری) مقابلوں کے کھلاڑیوں سے ترقی کرتے کرتے چمپئین بن چکے ھوں یا پھر، جب لڑکی والوں کو اپنی ھی لڑکی پر شک ھو کہ اس کا گھر میں بسنا مشکل ھے۔ وہ اصل میں یہ چاہ رھے ھوتے ھیں کہ جب ھماری لڑکی اپنے کرتوت سے لڑکے والوں کا ناک میں دم کر دے تو لڑکا ان کی لڑکی کو طلاق نہ دے سکے، اگر لڑکے پر شک ھو کہ یہ لڑکی کو بسائے گا نہیں تو پھر تو رشتہ ھی نہیں کیا جاتا۔ (مھربانی فرما کر شریف لوگوں کی فیملیوں اور ان کی لڑکیوں پر اس بات کو قیاس نہ کریں۔ یہ بات صرف ان لوگوں کے بارے میں ھے جو ذھنی مکاری کے کھلاڑی ھیں)۔ بعض بھولے دولھا اپنے بھول پن میں اپنی حیثیت سے بہت زیادہ بھاری بھر کم حق مہر مان لیتے ھیں اور بعد میں پریشان پھرتے ھیں، ایسا کرکے دراصل وہ اپنا ایک اسلامی حق کھو دیتے ھیں اور ایک طرح سے اسلامی اصول کی خلاف ورزی کے مرتکب ھوتے ھیں کیونکہ حق مہر دولھا کی مالی حیثیت کے مطابق ھی رکھنا چاھئے کیونکہ حق مہر دولھا کو ھر صورت ادا کرنا ھوتا ھے، جو ادا ھی نہ ھوسکے وہ حق مہر بالکل بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر دولھا کو حق مہر ادا کرنے کیلئے قرضہ لینا پڑے یا اپنی جائیداد بیچنی پڑے تو اس کو حق مہر کی بجائے ایک بوجھ یا تکلیف اور

زیادتی کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور اگر حق مہر ادا نہ کیا جائے تو یہ ایک گناہ ہے، حق تلفی ہے اور شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ حق مہر کیلئے شریعت میں کم از کم مقدار مقرر ہے اس سے کم ہر گز نہیں ہونا چاہئے اور دونوں فریقوں کی رضامندی بہت ضروری ہے اور اگر لڑکی والے دولھا کی آمدن سے زیادہ حق مہر پر اصرار کریں تو دولھا کو اور دولھا کے سرپرستوں کو اس سے صاف انکار کر دینا چاہئے، چاہے کچھ بھی ہو جائے اور اگر لڑکی والے شادی (نکاح) نہ کرنے کی (رشتہ توڑنے کی) دھمکی دیں تو لڑکے والوں کو فوراً سے پہلے اپنی برات خود ہی واپس لے جانی چاہئے۔ ساری زندگی کی بک بک سے وقتی پریشانی بہتر ہے۔ ساری زندگی کے نقصان سے کچھ پیسوں کا نقصان بہتر ہے، پیسے تو دوبارہ بھی کمائے جا سکتے ہیں۔ جن لوگوں (لڑکی والوں) کا آغاز ایسا ہے بعد میں تو وہ لڑکے والوں کو تگنی کا ناچ ضرور نچائیں گے، یہ بات الگ ہے کے ناچنا ان کو خود بھی پڑتا ہے لیکن اس بات کی انھیں سمجھ نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ایسے حالات ہو جائیں کہ عورت شوہر کو یا شوہر کے دیگر رشتے داروں کو تکلیف پہنچائے یا بے حیائی کی یا جہالت کی ایسی صورت اختیار کرے کہ شوہر کے پاس طلاق کے سوا کوئی راستہ نہ رہے اور بعض صورتیں تو ایسی ہیں کہ طلاق دینا واجب ہے۔ ایسی کسی صورت میں اگر طلاق دینا پڑی تو یہ حق مہر جو زیادہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی ادا نہ کیا ہوگا یہ مسئلہ بن جائے گا اور اگر دولھا کی مالی حیثیت سے زیادہ رکھا گیا حق مہر دولھا نے پہلے ہی یا اس وقت کسی طرح دے بھی دیا تو

دولھا مالی مشکالات کا شکار ضرور ھوگا۔ لہٰذا دولھا حضرات کو اصرار کرکے حق مہر اپنی مالی حیثیت کے مطابق اتنا ھی رکھوانا چاھئے جو وہ کسی مشکل کے بغیر آسانی سے دے سکیں، کیونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ھے، اس کے علاوہ پر انھیں رضامند ھی نہیں ھونا چاھئے، یہ ان کا شرعی حق ھے۔ حق مہر کے معاملہ پر دولھا حضرات کیلئے یہ مشورہ دینے سے پہلے میں نے شرعی راھنمائی حاصل کی ھے اور علماء کرام کی تائید اور حمایت سے ھی یہ مشورہ پیش کر رھا ھوں اور اگر کوئی یہ سوچے کہ طلاق تک نوبت آئے گی ھی نہیں، تو یہ اس کی خود فریبی ھے۔ طلاق سے بچنے کی ھر ممکن کوشش کرنی چاھئے، طلاق حلال کاموں میں ایک ناپسندیدہ کام ھے، لیکن طلاق کا امکان بہرحال موت تک موجود رھتا ھے، یہی حقیقت ھے اور حقیقت کو تسلیم کرنے ھی میں بہتری اور کامیابی ھے، بعض صورتیں تو ایسی ھیں جن میں طلاق دینا واجب ھو جاتا ھے اور واجب کو ترک کرنا (چھوڑنا) گناہ ھے اور اس پر دنیا میں وبال بھی آسکتا ھے اور آخرت میں پکڑ بھی ھو سکتی ھے۔ طلاق کی نوبت آنا ممکن ھے ورنہ طلاق کا کوئی وجود ھی نہ ھوتا۔ اسلامی اصولوں کی پیروی میں سب کیلئے آسانی اور خوشی ھے چاھے وہ لڑکا ھو یا لڑکی۔ یہ تو ایک الارم کی بات تھی لیکن حق مہر زیادہ نہ بھی ھو، مناسب بھی ھو اور لڑکی (بہو) کی ماں ایک شریف خاندان کی تیز طرار عورت ھو تو اکثر تیز طرار عورتیں (ساری بالکل بھی نہیں) ذھنی مکاری یا چالوں کی کھلاڑی ھوتی ھیں اور بیٹی کی شادی کی صورت میں ان کے پاس اپنی چالیں آزمانے کو ایک میدان

ھاتھ آ جاتا ھے، بعض مشاہدات میں تو یہ حیران کن بات دیکھنے میں آتی ھے کہ لڑکی کی ماں کی طرف سے تو کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ھوتا لیکن لڑکی کی خالہ اپنی بھانجی کے گھر کو کھیل کا میدان سمجھ کر اپن ذھنی عیاری کی چالیں آزماتی ھے اور نتیجہ اکثر طلاق ھی نکلتا ھے اور نتیجہ کے بعد خالہ صاحبہ اپنے گھر میں ایسی گھستی ھیں جیسے کوئی سانپ اپنے بل میں۔ اور اگر دولھا میاں ان ذھنی عیاریوں، مکاریوں کے کھیل ادراک نہ کر سکیں یا سیدھے سادھے ھوں تو ساری عمر یا اگر طلاق ھو جائے تو طلاق تک زندگی کے میدان میں بار بار ناک آؤٹ ھی ھوتے رھتے ھیں اور دولھا میاں کی ماں (اگر بھلی مانس ھو) الگ کڑھتی رھتی ھے، ورنہ پھر مقابلہ ھوتا ھے۔ اور اگر دو بھائیوں کی بیویاں ایک ھی گھر میں رھتی ھوں، تو مقابلہ شروع ھونے کے امکانات بہت زیادہ ھوتے ھیں اور ان کے خاوند جس دن اپنے بھائی کو اپنی بیوی کی آنکھ سے دیکھنا شروع کرتے ھیں اس گھر کی تباھی کا آغاز ھو جاتا ھے اور کچھ ھی عرصے میں آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ھے اور اکثر دیکھنے میں آیا ھے کہ بھائیوں کی لڑائیاں کروا کے، ان کو ایک دوسرے سے دور کر کے یہ عورتیں پھر ایک دوسرے سے ملنا شروع کر دیتی ھیں۔ شادی کی خوشیوں اور گھر کے سکون کی امیدوار صرف وھی دلھنیں بن سکتی ھیں جو اپنے خاوند کے گھر میں آ کر اپنے خاوند کے گھر والوں کی اسی طرح عزت کریں جسطرح اپنے ماں باپ کے گھر میں اپنے گھر والوں کی کرتی تھیں۔ خاوند کے گھر کی بات اپنے ماں باپ کے گھر میں اور اپنے ماں باپ کی بات اپنے

خاوند کے گھر میں بالکل نہ کریں اور اپنی ماں کی ہر اس بات سے جو ان کے خاوند کے گھر میں مداخلت ہو اس سے کان بند کر لیں اور جو دولھا سیدھے سادھے یا بھولے ہوتے ھیں ان کو اپنے بھولپن کے خول سے نکل کر ایک عقلمند خاوند بننا چاھئے۔ ماں باپ کی عزت اور احترام پر، اپنے گھر کے معاملات میں مداخلت پر، بیوی یا اس کے گھر والوں یا رشتے داروں کا کوئی لحاظ نہیں کرنا چاھئے، انھیں ہر صورت شروع ھی میں روک دینا چاھئے لیکن اس خوبصورتی سے کہ بیوی کے حقوق کی اچھے طریقے سے پاسداری قائم رھے اور بیوی کے گھر والوں کا احترام بھی قائم رھے۔ بھن بھائی اور ماں باپ کے رشتے کو بیوی کے دماغ سے نہیں سمجھنا چاھئے اور بیوی کی نظروں سے بالکل نہیں دیکھنا چاھئے بلکہ بیوی کو اپنے خاوند کے گھر والوں کو اسلام کی نظر سے دیکھنا چاھئے اور دولھا یا خاوند کو بیوی کے رشتے کو اور بیوی کے میکے کے افراد کے رشتے کو بھی اسلام کی نظر سے دیکھنا چاھئے۔ اگر کوئی خاوند اور بیوی خوشیوں اور سکون بھری زندگی کے متلاشی ھوں تو ایک خاوند کو اسلام میں بیوی کے حقوق کا، اپنے فرائض کا اور طلاق کے مسائل کا اور بیوی کو اسلام میں اپنے خاوند کے حقوق کا، اپنے فرائض کا علم حاصل کرنا چاھئے، اپنے ارد گرد کے لوگوں کے حقوق کے بارے میں اسلامی احکامات سیکھنے چاھئیں، اسلام میں بچوں کے حقوق کا علم حاصل کرنا چاھئے اور پھر اس علم پر اللہ عزوجل) کی رضا کیلئے عمل کرنا چاھئے، (اچھی نیت کے بغیر اچھے عمل کا ثواب بھی نھیں ملتا)۔ عمل کیلئے خلوص نیت اور علم

ضروری ھے اور جتنا عمل اچھا ھوگا خوشیوں کی امید بھی اتنی ھی بنے گی۔ اسلام زندگی کا مکمل ضابطہ حیات ھے اور زندگی کے ھر شعبے کے بارے میں کامل راھنمائی کرتا ھے۔ زندگی کے ھر معاملے میں اپنی عقلوں کے گھوڑے کو پہلے اسلام کے مکمل تابع کر دیجئے اور پھر اس کو جتنا چاھے بھگائیں، آپ کامیاب رھیں گے۔اپنی شادی شدہ زندگی میں بھی اور زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی۔ اسلامی اصولوں پر عمل خلوص نیت (اللہ جل جلالہ کی رضا) کیلئے عمل کرنے میں ھی بھلائی اور عافیت ھے۔ اگر کسی کو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اس بات کو یوں سمجھے کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے اور اعلی تعلیم یافتہ لڑکی میں طلاق کیوں ھوتی ھے۔ ان کی اعلیٰ تعلیم انھیں خوشیاں کیوں نہیں دلا سکتی۔ وجہ صاف ھے کہ آجکل اعلیٰ تعلیم کے اعلی اداروں میں اعلیٰ تعلیم تو ھے لیکن اسلام نہیں ھے اور جب اسلام نہیں ھوگا تو یہی حال ھوگا۔ پہلے یہ اعلیٰ تعلیم کے ادارے نہیں ھوتے تھے لیکن لوگ اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامے ھوئے تھے تو حال بہت اچھا تھا، مسلمان دنیا کے بڑے حصے پر حکمران تھے اور طلاق کی شرح نہ ھونے کے برابر ھی تھی۔ اسلام کو عملی طور پر اپنایئے اور دونوں جہانوں کی بھلائیوں سے اپنا دامن بھر لیجئے۔ لیکن جلدی کہیں دیر نہ ھو جائے اور اس دیر کی وجہ سے ایک اور طلاق نہ ھو جائے۔

سن انیس سو چھیاسی کی ایک کہانی، قسط 1

افسانوں میں نہیں حقیقت میں فون کی گھنٹی بجی۔ کسی نے فون نہیں اٹھایا تو ارباز کو جانا پڑا۔ ھیلو۔۔۔ کوئی لڑکی بولی۔ ارباز سے بات ہو سکتی ہے۔ ارباز کی عمر تقریباً سولہ سال تھی۔ بہن تھی نہیں اور ارباز کے ننھیال میں سے ایک بھی فرد دنیا میں نہیں تھا۔ گھر والے اور دوست، ددھیال کے چند رشتے دار۔ حلقہ احباب میں آج تک کوئی لڑکی نہیں تھی۔ ارباز کو کچھ سمجھ نہ آئی۔ او ہو۔ ارباز نام کو کوئی اور لڑکا ہوگا اور نمبر غلط ملا دیا ہے۔ بس یہی سوچ کر ارباز نے ہونٹ ہلائے۔ آپ نے غلط نمبر ملا دیا ہے۔ یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ساتھ ہی دوبارہ گھنٹی بجی۔ ارباز کے ھیلو کہتے ہی پہلے والی لڑکی دوبارہ بولی۔ آپ ارباز ہی تو بول رہے ہیں۔ پھر غلط نمبر کیسے ملایا۔ میں نے نمبر تو صحیح ملایا ہے۔ لڑکی تو دور کی بات ارباز کی سوچوں میں بھی کسی لڑکی کی گنجائش ابھی تک نہ بنی تھی۔ ارباز کو جھٹکا لگا۔ یہ تو مجھے جانتی ہے، کون ہے۔۔۔ آپ کون۔ ارباز نے پوچھا۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ ارباز سٹپٹا گیا۔ اچھی خبر دی ہے۔ کون سے ارباز کو فون کیا ہے۔ جو بات کر رہا ہے اسی ارباز کو۔ ارباز کو جواب ملا۔ میں تو اس کو جانتا نہیں، یہ کون ہے۔ ارباز جھنجھلا گیا۔ مجھے فون کیا۔ کس لئے۔ ارباز نے پوچھا۔ بات کرنے کیلئے۔ ہر بات کا چھوٹا سا جواب مل رہا تھا۔ اوہو

کیا بات کرنی ہے۔ ارباز نے پوچھا۔ جب سنیں گے تو کروں گی۔ یہ جواب سن کر ارباز کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تو آپ کے خیال میں ابھی تک میں سن نہیں رہا۔ ارباز دھاڑ پڑا۔ نہیں آپ لڑ رہے ہیں۔ اس جواب پر ارباز کی دھاڑ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ارباز نے ریسور ہاتھ میں پکڑا، عجیب لڑکی ہے۔۔ اچھا بولیں کیا بات کرنی ہے، میں سن رہا ہوں۔ ارباز بڑی تمیز سے بولا۔ کل بلیک جینز میں بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ ارباز کو لگا کہ یہ بات لڑکی نے گنگنا کر کی ہے۔

ارباز کی ٹانگیں کانپیں، اور پھر ہاتھ۔ ارباز نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔ یہ 1986 کی بات ہے۔ اس وقت کے سولہ سال کے شریف لڑکے لڑکیوں کے معاملے میں آجکل کے لڑکوں جتنے ایڈوانس نہیں تھے۔ ارباز تقریباً بھاگتا ہوا گھر سے نکلا اور سیدھا شیراز کے گھر جا پہنچا۔ گھر میں والد سخت تھے۔ والدہ کو مار کھانے سے اور گھر کے کام کاج سے فرصت نہیں ہوتی تھی اور سانس پھولتے ہوئے ارباز کی پہنچ اس کے دوستوں تک ہی تھی۔ یار بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اچھا۔ جلدی سے میرے کمرے میں آ۔ یہ کہتے ہوئے شیراز کا اپنے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ شیراز نے کمرہ کا دروازہ بند کیا اس نے ارباز کو دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔ منہ کے سامنے منہ کیا اور ایک ڈری ڈری سے سرگوشی کی، کیا ہوا۔ تیرے ابو مار رہے ہیں آنٹی کو۔ نہیں یار وہ تو گھر ہی نہیں ہیں۔ وہ یار ایک لڑکی

کا فون آیا ہے دو بار۔ کہہ رہی تھی کہ کل بلیک جینز میں بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ ابو کو پتہ لگ گیا تو وہ مجھے ماریں گے۔ ابھی صبح بھی مارا تھا۔ شیراز کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آ گئے۔ اور کچھ کہا اس نے۔ شیراز نے پوچھا۔ کہہ رہی تھی کہ آپ سے بات کرنی ہے۔ ارباز کی یہ بات سن کر شیراز کے بھی ہوش اڑ گئے۔ دونوں دوست ایک ہی جیسے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے اور دونوں کے رنگ فق تھے۔ کچھ دیر بعد ارباز گھر پہنچا۔ شیراز کے مشورے سے ایک بات سوچ لی تھی۔ ارباز ہر فون بھاگ بھاگ کر اٹھاتا اور اگلے دن اسی لڑکی کا فون آ گیا۔ کیا حال ہیں آپ کے۔ یہ لڑکی کا سوال تھا۔ دیکھیں آپ یہاں فون نہ کریں۔ میں لڑکیوں سے بات نہیں کرتا۔ میرے ابو کو پتہ لگا تو وہ مجھے ماریں گے۔ ارباز نے یہ کہہ کر ریسور فون پر پٹخا اور بھاگم بھاگ شیراز کے گھر پہنچ گیا۔ یار میں نے کہہ دیا۔ جان چھوٹی۔ اس نے کیا کہا پھر۔ شیراز نے یہ بات سن کر پوچھا۔ میں نے فون بند کر دیا تھا۔ ارباز نے بتایا۔ چل ٹھیک ہے۔ شیراز نے دو عمران سیریز رسالے نکالے اور دونوں نے وہ رسالے پورے پڑھے اور ارباز گھر آ گیا۔

سن انیس سو چھیاسی کی ایک کہانی، قسط 2

آج اتوار تھا۔ ارباز نے اپنے فٹبال کھیلنے والے خاص جوتے بڑے شوق سے صاف کئے۔ آج میچ تھا۔ ابھی ایک ہی جوتا پہنا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ یہ امی بھی بس کام کرتی رہتی ہیں یا بیٹھ کر تسبیحیاں کرتی رہتی ہیں۔ فون کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ یہی سوچتے سوچتے ارباز نے فون اٹھایا اور جیسے ہی ارباز نے ہیلو کہا تو اس کے کان میں دھماکے ہونے لگے۔ روزانہ فون کرتی ہوں اور آپ فون نہیں اٹھا رہے۔ کیا سر کی ٹنڈ کروانے کے بعد فون سننا منع ہے۔ لڑکی کی آواز سن کر ارباز سٹپٹا گیا۔ ابو نے ارباز کی ٹنڈ کروا دی تھی۔ لیکن اس کو ساری خبر تھی اور فون کرنا بھی بند نہیں کیا تھا۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ یہاں فون مت کریں۔ میں آپ کو جانتا ہی نہیں اور آپ کو کس نے بتایا میری ٹنڈ کے بارے میں۔ ارباز ایک سانس میں بولتا ہی چلا گیا۔ فون تو میں کروں گی۔ میں تو آپ کو جانتی ہوں۔ کسی نے مجھے بتایا نہیں میں نے خود آپ کو دیکھا ہے۔ جواب بھی ایک ہی سانس میں آیا۔ دیکھیں آپ کیوں فون کریں گی۔ ارباز نے پریشانی سے پوچھا۔ بات کرنے کیلئے۔ لڑکی نے جواب دیا۔ آپ ہیں کون۔ ارباز نے سوال کیا۔ میں صائمہ ہوں۔ لیکن مجھے لڑکیوں سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔ آپ مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتی ہیں۔ ارباز نے لڑکی کی بات ان سنی کر کے سوال کیا۔ اگر

نہیں کریں گے تو ٹھیک ہے میں آپ کے ابو سے بات کروں گی۔ یہ سن کر ارباز کو غصہ آ گیا۔ کریں بڑے شوق سے۔ ارباز نے جواب دیا۔ آپ مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں نہیں کرنی جو مرضی کر لو۔۔ میں میچ کھیلنے جا رہا ہوں۔ بھاڑ میں جاؤ۔ ارباز نے ریسیور فون پر پٹکا اور غصے سے بھرا سیدھا امی کے پاس پہنچ گیا۔ امی میں میچ کھیلنے جا رہا ہوں۔ ابو کو بتا دینا۔ سبزی کاٹتی امی ارباز کی بات سن کر چونکیں۔ اتنے غصے سے جا رہے ہو۔ کیا بات ہے۔ امی نے پوچھا۔ کچھ نہیں امی، میں جا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر ارباز باہر بھاگا۔ پہلے ہی کچھ دیر ہو چکی تھی۔

رات کے کھانے پر ارباز کی امی نے ابو کو بتایا کہ کوئی لڑکی بار بار فون کر رہی ہے۔ اسے دلاور سے بات کرنی ہے۔ ارباز کے کان اور آنکھیں امی کی طرف گھوم گئے۔ اب آیا تو مجھے بتانا۔ ابو کا یہ جواب سن کر ارباز کو متلی ہونے لگی۔ اگر یہ وہی لڑکی ہوئی اور اس نے ابو سے میرے بارے میں کوئی غلط بات کر دی۔ تو۔۔۔ پھر۔ یہ سوچ کر ارباز کی طبعیت خراب ہونے لگی۔ ارباز نے جیسے تیسے کھانا کھایا اور جا کر فون کا ریسور نیچے رکھ دیا۔ یہ لڑکی ہے کون۔ ارباز کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔۔ امی ابو تو سو گئے لیکن ارباز کا ذہن اس لڑکی کو ہی سوچے جا رہا تھا، کہ فون کی گھنٹی بج گئی۔ ابو یا امی نے یا پھر چھوٹے بھائی نے ریسیور اوپر رکھ دیا تھا۔ ارباز نے جست لگائی اور

خاموشی سے ریسیور کان سے لگایا۔ وہی لڑکی تھی۔ ہیلو ہیلو کیے جا رہی تھی۔ آپ کو مسئلہ کیا ہے۔ ارباز نے بڑے دھیرے سے پوچھا۔ اچھا تو آخر آپ نے فون اٹھا ہی لیا۔ صاف پتہ لگ رہا تھا کہ لڑکی مسکرا رہی تھی۔ یہ سارا دن فون آپ تو نہیں کرتی رہیں۔ ارباز نے پریشانی سے پوچھا۔ ہاں میں نے کیا ہے۔ آپ کے ابو سے بات کرنی تھی۔ اس جواب نے ارباز کے ہوش اڑا دئے۔ تمہیں کیا بات کرنی تھی۔ ارباز نے پوچھا۔ آپ مجھے تمہیں نہیں بلکہ آئندہ صائمہ کہیں، میں نے آپ کی شکایت کرنی تھی کہ آپ ہمارے گھر فون کر کے تنگ کرتے رہتے ہیں۔ صائمہ کی اس بات پر ارباز کے چہرے پر کئی رنگ گزر گئے۔ آپ فون خود کرتی ہیں۔ مجھے آپ کا نمبر بھی نہیں پتہ۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو مجھے خوامخواہ مار پڑ جائے گی۔ ارباز نے منت سماجت شروع کر دی۔ ٹھیک ہے اگر آپ مجھ سے بات کرتے رہیں گے تو میں ایسا نہیں کروں گی۔ صائمہ کے اس مطالبے کے بعد ارباز اور صائمہ میں ایک معاہدہ ہو گیا۔ اس معاہدے کے تحت ارباز کو صائمہ سے بات کرتے رہنا تھا اور صائمہ صرف رات کو فون کرنے کی پابند ہو گئی تھی۔ کسی اور کے فون اٹھانے پر صائمہ نے فون بند کر دینا تھا۔ اس دور میں سی ایل آئی نہ ہونے کی وجہ سے نمبر ٹریس ہونے کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ ارباز نے یہ معاہدہ تو طے کر لیا۔ لیکن بات کیا ہو گی۔۔۔ یہی سوچتے سوچتے اگلی رات آ گئی۔

سن انیس سو چھیاسی کی ایک کہانی، قسط 3

ارباز نے رات سے پہلے ہی بڑے خفیہ طریقہ سے فون کی تار سے ایک تار اپنے کمرے تک لگا لی تھی۔ جیسے ہی امی ابو سوئے، ارباز نے فون سیٹ اتارا اور اپنے کمرے میں لگا لیا۔ عین وقت پر صائمہ کی کال آ گئی۔ کیا کر رہے تھے یہ پہلی بات تھی اور کیا کیا پسند ہے، دوست کتنے ہیں۔ یہ درمیان تھا۔ جس کا دورانیہ دو گھنٹے کا تھا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اگر آپ وقت پر فون سنتے رہیں گے تو آپ کے ابو سے کبھی بات نہیں کروں گی۔ اور لمبی باتیں نہیں ہوں گی اور صرف ہفتے کو بات کیا کریں گے، یہ بات چیت کا اختتام تھا۔ فون بند ہو گیا، ارباز نے فون سیٹ واپس لاؤنج میں لگا دیا۔ صرف یہ باتیں کرنے کیلئے فون کیا تھا۔ نہیں یہ تو کوئی خاص باتیں نہیں ہیں۔ بات اور کچھ ہو گی، آخر سامنے آ ہی جائے گی۔ یہ سوچتے سوچتے ارباز کی آنکھ لگ گئی۔ پھر کئی ہفتے گزر گئے۔ باتیں چلتی گئیں۔ باتوں کا وقت بھی بڑھتا گیا۔ ارباز کو بھی صائمہ کی عادت ہو گئی۔ صائمہ نے بھی ارباز کی وجہ سے مظہر کلیم کے عمران سیریز رسالے خریدنے شروع کر دئے تھے۔ جو بھی نیا رسالہ آتا ارباز صائمہ کو فون پر سارا پڑھ کر سناتا اور اگلا نیا رسالہ صائمہ کو پڑھ کر سنانا ہوتا تھا۔ نہ کوئی ملاقات، نہ کوئی عشق و محبت کی باتیں، عجیب ناقابل یقین سا بھولپن تھا۔ صائمہ ارباز کا بہت خیال رکھتی تھی

شاید اسی لئے ارباز کا غصہ دب سا گیا تھا لیکن ارباز کا تجسس دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا کیونکہ صائمہ کو ارباز کے گھر کا بھی پتہ تھا اور ارباز کو صائمہ کا گھر تو کیا، گھر کے فون نمبر کا بھی پتہ نہیں تھا۔ صائمہ تھی بہت اچھی۔ ایک اچھے دوست کی مانند۔ شروع میں ابو سے بات کرنے کی دھمکیاں تو دی تھیں لیکن اب ارباز کو اس سے کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ ایک اعتماد قائم ہو چکا تھا۔ آج دو سال گزر چکے تھے اور ارباز کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ارباز کا کہنا تھا کہ اسے اپنا گھر اور گھر کا فون نمبر اب بتانا ہوگا۔ کئی دفعہ اسی بات پر لڑائی ہوئی اور بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ارباز کے ہاتھ بھی صائمہ کی کمزوری آ گئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ صائمہ اس کے ساتھ بات کئی بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ ایک سال اور گزر گیا۔ دونوں اب جوانی کی حدوں کو چھو رہے تھے لیکن ابھی تک فلمی اثر سے محفوظ تھے لیکن نہ جانے کیسے۔ آخر ارباز نے ایک فیصلہ کر لیا۔ کہ اب فون نمبر اور گھر کا ایڈریس لے کر ہی رہوں گا۔ ہر قیمت پر۔ ارباز کا موڈ بدل گیا۔ ارباز صائمہ کو خوب تنگ کرتا۔ فون انگیج کر دیتا اور جب صائمہ اس بات پر لڑتی ۔ تو ارباز کا ایک ہی جواب ہوتا۔ فون نمبر اور گھر کا ایڈریس بتا دو کبھی ایسے نہیں کروں گا۔ صائمہ نے بھی اپنی ضد توڑی اور اپنے بارے میں بتانا شروع کیا، لیکن صرف ایک ایک لفظ اور وہ بھی قسطوں میں۔ میں گارڈن ٹاؤن میں رہتی ہوں۔ کس بلاک میں اور گھر کا کیا نمبر ہے۔ ارباز نے بڑے جوش سے پوچھا۔ اگلی دفعہ بتاؤں گی۔ یہ کہہ کر

صائمہ نے فون بند کر دیا۔

سن انیس سو چھیاسی کی ایک کہانی، قسط 4

آج ہفتہ تھا اور ارباز کو بڑی بے چینی سے رات کا انتظار تھا۔ آخر رات بھی آ گئی اور فون بھی آ گیا۔ آپ گارڈن ٹاؤن میں رہتی ہو اور گھر کا نمبر کیا ہے۔ بلاک کون سا ہے۔ ارباز جذباتی ہو گیا تھا اور آج بات بھی سوال ہی سے شروع کر دی تھی۔ نہ سلام نہ دعا اور گھر بتا دوں۔ میں نہیں بتا رہی۔ صائمہ نے بھی غصے کا سہارا لے کر جواب دیا۔ لیکن آپ نے کہا تھا کہ کل بتاؤں گی۔ میں کل سے انتظار کر رہا ہوں۔ ارباز نے منت کی۔ اچھا تو میرا پتہ اور نمبر جاننے کیلئے انتظار تھا اور میرا انتظار ہی نہیں تھا۔ میرے نمبر کی اہمیت مجھ سے زیادہ ہے۔ صائمہ کو اب باقاعدہ غصہ آ گیا تھا۔ اس جواب پر ارباز سٹپٹا کر رہ گیا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ آپ ہو اور نمبر نمبر ہے۔ بس آپ اپنا وعدہ پورا کرو۔ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ کل بتاؤ گی۔ ارباز نے اپنا مطالبہ دھرایا۔ آپ کو میرے گھر کے پتے اور نمبر کا انتظار تھا۔ اور میرا انتظار ہی نہیں تھا۔ میں تو آپ کی کچھ لگتی ہی نہیں۔ گارڈن ٹاؤن، احمد بلاک میں مین روڈ کے ساتھ تھوڑا سا اندر ایک ہی پارک ہے اور پارک کے سامنے میرا گھر ہے۔ ٹھک۔ صائمہ نے یہ کہہ کر بڑی زور سے ریسیور کو بڑی زور سے کریڈل پر پٹخا تھا لیکن ارباز کو ایسے لگا جیسے ریسیور اس کے کان پر گرا ہو۔ ہمیشہ اچھے انداز میں بات کرنے والی صائمہ آج

بہت غصے میں آ گئی تھی۔ میرا انتظار ہی نہیں تھا۔ میں آپ کی کچھ لگتی ہی نہیں۔ کافی دیر تک ارباز ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ارباز لیٹ گیا لیکن پھر یک دم ارباز اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارباز کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا تھا، اگر صائمہ نے آج کے بعد فون ہی نہ کیا تو پھر۔ تو نہ کرے۔ لیکن اسے اسطرح نہیں کرنا چاہئے۔ فون تو کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اپنا پتہ کیوں نہیں بتاتی۔ میں نے کوئی گالی غلط بات تھوڑی پوچھی ہے۔ خود ہی فون کرتی ہے اور اپنا نمبر تک نہیں بتاتی۔ نہ کرے بھاڑ میں جائے۔ نہیں نہیں وہ دشمن تھوڑی ہے جو بھاڑ میں جائے۔ اتنی اچھی لڑکی ہے۔ میرا اتنا خیال رکھتی ہے۔ اس نے اب تو کبھی تنگ بھی نہیں کیا۔ اگر اس نے فون نہ کیا تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ اوہو کیا کروں۔ اسے کہاں ڈھونڈوں۔ لیکن کیوں ڈھونڈوں۔ دوست ہے اور بہت اچھی دوست ہے۔ لیکن وہ تو ناراض ہو گئی ہے۔ تو کیا ہوا میں اسے منا لوں گا۔ اسے کہوں گا کہ اپنا پتہ مت بتاؤ۔ لیکن فون کرنا مت چھوڑنا۔ ارباز ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری بات اور کتنا کچھ سوچتا ہی گیا اور نہ جانے کس وقت آنکھ لگ گئی۔

خبردار - خبردار

آپ کو کہیں کبھی کوئی رقم راستے میں پڑی ملی ہے۔ کبھی نہیں یا شاید کبھی ملی بھی ہو، لیکن آپ اور ہم جانتے ہیں کہ ایسا کسی کی غلطی کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ رقم، عام استعمال کی دوسری اشیاء کبھی سڑکوں پر پڑی نہیں ملتیں، کیونکہ ان کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کو سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اپنی حفاظت کیلئے، اپنی ضروری اشیاء کی حفاظت کیلئے کچھ بھی کر لیتے ہیں لیکن غیر ضروری اشیاء بھی آپ کو سڑکوں پر پڑی نہیں ملیں گی، کیونکہ چیزیں یوں ہی نہیں آ جاتیں، کبھی ان کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے، ہاں جب پورا یقین ہو جائے کہ اب یہ چیز استعمال کے قابل ہی نہیں رہی تو پھر اس کو کوڑے دان کے سپرد کر دیا جاتا ہے یا پھر گھما کر گھر سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس ملک کو اسلام کے نام پر بنایا گیا ہے۔ بنانے والے مسلمان ہی تھے۔ سب مسلمان ایک اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی عبادت کرتے ہیں۔ حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں، حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا محبوب مانتے ہیں۔ لیکن افسوس یوں لگتا ہے کہ ان کو (اکثریت کو) اللہ تعالیٰ جلّ شانہ اور حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ کے ادب کی سوچ ہی نہیں ہے۔ (اکثریت) گلی محلے کے دیندار، پڑھے لکھے اور ان پڑھ دوکاندار، چھوٹے

اور درمیانے درجے کے ھوٹلوں والے، اخبارات پڑھنے والے پڑھے لکھے لوگ، گھروں میں اخبارات پہنچانے والے، اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زیر نگرانی قائم دفتروں میں شیشے صاف کرنے والے اور بہت سے لوگ مسلسل روزانہ بڑی ڈھٹائی سے اللہ تعالیٰ جلّ شانہ اور حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک اسمائے مبارکہ کی بے ادبیوں میں مصروف ھیں۔ ڈھیٹ لوگوں کو سمجھایا بھی جائے تو عجیب جاہلانہ جواز پیش کرتے ھیں۔ کئی دفعہ دیکھا ھے کہ کس سیاسی پارٹی کے لیڈر کی تصویر کو مخالف سیاسی پارٹی کے کارکنوں نے چوکوں میں جلایا تو اس پر خوب احتجاج کیا گیا۔ یہ سیاسی لیڈر اور ان کے سیاسی ورکر وہ لوگ ھیں جنھوں نے اس ملک کا بیڑا غرق کر دیا۔ ان لوگوں کو اتنا شعور ھے کہ ان کے لیڈر کی تصویر کے بے ادبی نہیں ھونی چاھئے لیکن وہ جن کو اللہ تعالیٰ جلّ شانہ اور حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ ھے ان کا شعور اور ان کی محبت جانے کہاں چلی گئی ھے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ سب سے بڑا ھے۔ سب کا پروردگار، سب کا پالنے والا، ھم سب کا پیدا کرنے والا۔ اس کے نام کی بے ادبیاں سرعام ھو رھی ھیں، لیکن مسلمان کہلانے والوں پر کوئی اثر نہیں۔

حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ مشہور بزرگ ھیں۔ بزرگ ھونے سے پہلے آپ ایک دفعہ نشہ و مستی کی حالت میں کہیں جا رہے تھے۔ اسی حالت میں کاغذ کا

ایک ٹکڑا آپ کو پڑا ہوا ملا جس پر بسم اللہ لکھا ہوا تھا۔ آپ نے اس کاغذ کو اٹھا کر صاف کیا اور عطر سے معطر کیا۔ پھر ایسی جگہ رکھا جہاں بے ادبی ہونے کا خوف نہ تھا۔ اسی رات خواب میں اللہ تعالیٰ نے ایک بزرگ آدمی کو حکم فرمایا کہ تم جا کر بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ سے کہہ دو "تم نے ہمارے نام کی عزت کی اور اس کو معطر کرکے بلند جگہ پر رکھا ہم بھی اسی طرح تم کو پاک کرکے تمہارا مرتبہ بلند کریں گے۔" یہ حکم سن کر وہ بزرگ حیران ہوئے اور انہوں نے دل میں سوچا کہ بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ تو ایک فاسق و فاجر آدمی ہے یقیناً میرا خواب غلط ہے چنانچہ وہ وضو کرکے دوبارہ سو گئے اب کی دفعہ بھی خواب میں وہی حکم ہوا لیکن قوت متصورہ کی غلطی سمجھ کر تیسری بار وضو کر کے پھر سو گئے۔ پھر وہی خواب دیکھا۔ چنانچہ وہ بزرگ صبح اٹھ کر آپ کے گھر تشریف لے گئے اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ شراب خانے میں ہوں گے اور وہاں سے پتہ چلا کہ آپ نشے میں بے سدھ پڑے ہیں۔ بزرگ نے لوگوں سے کہا تم اس سے کہو کہ میں اسے پیغام دینا چاہتا ہوں" لوگوں نے جا کر انہیں بتایا۔ انہوں نے کہا پوچھ کر آؤ ل کس کا پیغام ہے"۔ بزرگ نے کہا اللہ تعالیٰ کا پیغام لایا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا نام سنتے ہی آپ ڈر گئے اور رو پڑے کہ نہ جانے موت کا پیغام ہے یا عتاب الٰہی کا۔ ڈر کی وجہ سے نشہ ہرن ہو گیا۔ ارد گرد سے لوگوں کو ہٹا دیا۔ پیغام سن کر توبہ کی۔ دوستوں سے کہا "اب تم اس کام میں مجھے ہر گز نہ دیکھو گے"۔ توبہ کے بعد آپ نے ریاضت و مجاہدہ شروع

کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے نام میں ایسی برکت پیدا کر دی کہ جو کوئی سنتا اسے راحت حاصل ہوتی۔

آپ حافی (ننگے پاؤں والا) مشہور ہوئے۔ لوگوں نے آپ سے ننگے پاؤں چلنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ توبہ کے وقت ننگے پاؤں تھا۔ اب مجھے جوتا پہنتے ہوئے شرم آتی ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ اکثر آپ رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد کہتے کہ اس کے باوجود کہ علم، فقہ، حدیث اور اجتہاد میں آپ کی نظیر نہیں ملتی ایک دیوانے کے پاس آپ کا جانا سمجھ سے بالاتر ہے اور یہ امر آپ کی شان کے خلاف ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا، "تمہاری نسبت میں اپنے علم کو زیادہ جانتا ہوں، لیکن حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں"۔

مسلمان کہلانے والے حکمرانوں، اور عوام کیلئے لمحہ فکریہ ھے، کچھ کرنا ھوگا، جسطرح اپنی رقم کو سنبھال کر رکھتے ھیں۔ پاک اسمائے مبارکہ کے ادب اور عظمت کے تقاضوں کو پورا کرنا ھوگا۔ ھر قیمت پر۔ جاھل دوکانداروں اور اخبار

کو گھما کر پھینک گھروں میں پھینک کر بے ادبی کرنے والوں کو روکنا ھوگا، ورنہ کہیں ایسا نہ ھو کہ بے اثر دعائیں بے اثر ھی رھیں اور ھم نئی نئی بیماریوں، پریشانیوں اور عذابوں میں پھنسے ھی رھیں۔ حضرت بشر حافی رحمتہ اللہ تعالی علیہ تو ادب کرکے بلند مقام پا گئے، لیکن کہیں بے ادبیاں کرنے والے اور ان بے ادبیوں سے آنکھیں چرانے کے سبب اس ملک کے رھنے والے عبرت نہ بن جائیں۔

: مشورہ

باادب بانصیب ---------- بے ادب بے نصیب

اپنے نصیبوں کی حفاظت کیجئے اور انھیں بہتر کیجئے۔

جسطرح اپنے ضروری کاغذات کو سنبھال کر رکھتے ھیں اسی طرح اپنے گھر میں ایک پلاسٹک بیگ میں مقدس کاغذات اکٹھے کر لیا کریں، اخبارات کو بھی اکٹھا کر لیا کریں، اور کبھی جا کر دریا میں بہا دیا کریں، کوئی ایک بھی جا سکتا ھے، آخر شادیوں، جنازوں، سالگروں پر بھی تو جاتے ھی ھیں۔ دوکانداروں کو بھی محبت سے سمجھا دیا کریں اور سودا سلف پلاسٹک کے بیگ (شاپر) ھی میں لیا کریں، اس پر اصرار کیا کریں اور اخبارات میں سودا لینے سے انکار کر دیں۔ اخبارات سے شیشے صاف کرنے کی بجائے صاف کپڑے استعمال کیا کریں۔ سبزیاں اور دوسری

چیزیں ہاتھوں میں لے کر آتے ھیں، کوئی ان کو گھما کر گھر کے اندر نہیں پھینکتا تو پھر بے ادبی سے بچنے کیلئے تھوڑی سی توجہ سے اخبارات بیچنے اور لینے کا نظام بھی بنایا جا سکتا ھے۔

کلمہ پڑھنے والوں، مجھے ضرور پڑھنا

کچھ لوگ ایسے ھیں کہ جب کسی وڈیرے کے کتے کسی بچی پر، لڑکی پر حکماً حملہ کر دیں ، عورتوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیا جائے، جائیداد ھتھیانے کیلئے لڑکیوں کی شادی نہ ھونے دی جائے، کسی کی بیٹی کسی کے گھر میں ملازمہ ھو اس کی عزت لوٹ لی جائے، پولیس مار مار کر کسی کا بھرکس نکال دے، پرامن جلوسوں پر پولیس لاٹھی چارج کرے، آنسو گیس پھینکے، بیچ چوک میں ڈنڈے مار مار کر انسانوں کو مار ھی دیا جائے، پولیس والے تھانوں میں پکڑی جانے والی خواتین سے ڈانس کروائیں، چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ مار پیٹ کی جائے تو کچھ لوگ خاموش ھی رھتے ھیں، تشدد تشدد کا شور نہیں مچاتے، اخلاقیات اخلاقیات کا رونا بھی نہیں روتے۔ میڈیا پر آنے والی خبروں کے مطابق پاکستان کے قانون کے مطابق، تمام تر قانونی تقاضے پورے ھونے کے بعد، بے شمار گواھیوں کے بعد، اپنے جرم کے اقرار کے بعد آسیہ کو عین انصاف کے تقاضوں کے مطابق سزا سنائی گئی، یہ کچھ لوگ حرکت میں آ گئے۔ یہ کچھ لوگ سزا ھی کا انتظار کر رھے تھے۔ جیسے ھی سزا ھوئی، سزا کے فوراً بعد اپنے ایک خاص ایجنڈے کے مطابق ٹی وی چینلوں پر آ کر اچھل کود کرنے لگے۔ یہ کچھ لوگ سزا یافتہ آسیہ کی سزا کی آڑ میں، پاکستان کے آئین اور قانون کے خلاف، معزز عدالت کے خلاف، پاکستان کے تمام مکاتب فکر کی حمایت سے نافذ کئے

گئے متفقہ قانون کے خلاف، اٹھ کھڑے ہوئے ھیں۔ اگر یہ سمجھتے ھیں کہ فیصلہ غلط ھے تو قانون موجود ھے، قانون کی پیروی کرتے، عدالت میں جاتے، لیکن ایک شور برپا کر دیا گیا اور شور مچایا جا رھا ھے۔ دین اور انصاف سے ذھنی اور عملی طور پر ناآشنا لوگ ٹی وی پر آ کر ایک اھم قانون اور مسئلے پر اپنی رائے کے نام پر عجیب بے تکی باتیں کر رھے ھیں۔ یہ کچھ لوگ اس مقدمے کی آڑ لے کر ناموس رسالت کے قانون کی مخالفت میں متحرک نظر آ رھے ھیں۔ یہ وہ قانون ھے جو 1400 سال پہلے دنیا والوں کا عطا کیا گیا تھا، یہ قرآن پاک کا قانون ھے اور یہ وہ قانون ھے جس کے دم سے انصاف ھے۔ جی ھاں، وہ مقدس اور نورانی ھستیاں جن کے ذریعے سے، جن کی وجہ سے اس دنیا کے انسانوں کو (جو ھوئے، ھیں اور ھوں گے) انصاف اور اخلاق کی دولتیں عطا فرمائی گئیں، یہ ناموس رسالت کا قانون انھیں تمام مبارک ھستیوں کو اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی بارگاہ سے ملنے والے مقام کا اقرار ھے اور ان کی عصمتوں کا تحفظ ھے۔ ھر انسان اپنے پیاروں سے پیار کرتا ھے، ان کی عزت کا تحفظ چاھتا ھے۔ سب کا پیدا کرنے والا اور سب کا پالنے والا اللہ تعالیٰ جلّ شانہ بھی اپنے پیغمبروں علیھم السلام سے پیار کرتا ھے، یہ پیغمبر وہ ھیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کا پیغام ھر دور میں بڑی محنت اور قربانیوں سے اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی مخلوق تک پہنچایا ھے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ ھی نے دین اسلام اور قرآن ، حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے عطا فرمایا

ھے اور ناموس رسالت کا قانون تمام انبیاء علیھم السلام کی عصمت کے تحفظ کا قرآنی قانون ھے۔ ، قرآن پاک میں فرشتوں کی صفت بیان کی گئی ھے۔

سورہ تحمریم۔ آیت 6۔ لایعصون اللہ ماامرھم ویفعلون مایؤمرون۔

ترجمہ ۔ جو اللہ کا حکم نہیں ٹالتے اور جو انہیں حکم ہو وہی کرتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ فرشتوں سے نافرمانی ھونا ناممکن ھے اور انبیاء کرام علیھم السلام تو ان فرشتوں سے سارے جہان سے افضل ھیں، ان سے نافرمانی ھونا ناممکن ھے اور ایسا تو سوچا بھی ، نہیں جا سکتا۔

سورہ بقرہ آیت 124 میں فرمان خداوندی ھے ۔ لاینال عہدی الظالمین ۔۔ ترجمہ ۔ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔۔۔

یعنی ظلم (فسق) اور نبوت جمع ھو ھی نہیں سکتے۔

سورہ احزاب آیت 36 میں ارشاد رب کریم جل جلالہ ھے۔

وماکان لمؤمن ولامؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالا مبینا۔

ترجمہ : اور کسی مسلمان مرد نہ مسلمان عورت کو پہنچتا ہے کہ جب اللہ و رسول کچھ حکم فرمادیں تو انہیں اپنے معاملہ کا کچھ اختیار رہے اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اس کے رسول کا وہ بیشک صریح گمراہی بہکا۔۔۔

ذرا غور کیجئے، قرآن کی گواھی بھی ھے، یہ قرآن پاک اللہ کریم جل شانہ کا کلام ھے اور بتایا جا رھا ھے انبیاء کرام علیہم السلام سے ظلم ممکن ھی نہیں ھے۔ اور جو اللہ کریم جل شانہ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نہ مانے وہ گمراہ۔

اب ذرا یاد کیجئے، کہ فتح مکہ کے لئے لشکر جا رھا ھے، رحمت عالم، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ساتھ ھیں۔ راستے میں ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رھی تھی اور اگر لشکر ادھر سے گزرتا تو لشکر کی ھیبت سے کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلانا چھوڑ بیٹھتی، میرے اور آپ کے محبوب پاک، محبوب رب کریم، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا اور لشکر کا راستہ تبدیل کر دیا گیا۔ فتح مکہ ھو گئی اور سب کو معاف کر دیا گیا۔ لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخ ان کے رب کریم جل شانہ کو گوارا ھی نہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو وھی کرتے ھیں جو اللہ کریم جل شانہ چاھتا ھے۔ توھین رسالت کے مرتکب افراد کو قتل کرنے کا حکم ھوا، فرمایا کہ اگر غلاف کعبہ کے پیچھے ھوں تو تب بھی قتل کر دیا جائے۔

یہ ناموس رسالت کا قانون اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی مرضی اور خوشی ھے، یہ نافذ ھی رھے گا۔ اگر کچھ لوگ اسے نافذ کرنے سے انکار بھی کریں گے، اس قانون

کے خلاف چلیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے قانون کے خلاف چلیں گے، یہ لوگ مٹ جائیں گے اور مٹنے کے ساتھ عبرت بھی بن جائیں گے۔

سورہ کوثر آیت آیت 3 میں ارشاد رب کریم جل جلالہ ھے ۔

ان شانئک ہو الابتر۔

ترجمہ : بے شک جو تمہارا دشمن ہے وہی ہر خیر سے محروم ہے۔

جنات آگ سے بنے ھیں اور شیطان بھی جن تھا۔ بہت زیادہ عبادت گزار تھا، فرشتوں کا سردار بنا دیا گیا، لیکن حضرت آدم علیہ السلام کی گستاخی کر بیٹھا، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے ان کو جو شان عطا فرمائی تھی، اس شان کا انکار کر بیٹھا، بس مردود ھو گیا، اسے دھتکار دیا گیا، سرداری سے معزول ھوا اور اپنے مرتبے اور مقام سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اور عبرتناک سزائیں اس کا مقدر کر دی گئیں ھیں۔ صرف فرعون، ھامان، شداد، نمرود، ابی بن خلف، ابولہب ھی کی عبرت ناک مثالیں سمجھنے کیلئے کافی ھیں اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ اس بات پر قادر ھے کہ جن لوگوں کو چاھے چن لے اور ان کے ذریعے اس قرآنی قانون کو نافذ کروا دے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ چاھے تو بندوں کے بغیر بھی اس قانون کو نافذ کر سکتا ھے، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ جو چاھتا ھے کر سکتا ھے اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ وسیلے سے بھی عطا فرماتا ھے۔ پاکستان کے آئین کا حصہ بنائے

جانے سے پہلے بھی تمام مسلمانوں کا یہی قانون اور مذھب تھا، اسی کی پیروی کی جاتی تھی، گستاخوں کی سزا موت ھی تھی، لہٰذا اسے آئین میں بھی درج کر دیا گیا۔ ان کچھ لوگوں کو علم ھی نہیں یا یہ پاکستان کے آئین کے ساتھ کسی سازش میں مصروف ھیں، یہ ایک نہایت توجہ طلب نکتہ ھے۔ یہ کچھ لوگ اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کرکے اپنا ایک تاثر قائم کرکے، اپنی انصاف اور اخلاق کے منافی، فساد پر مبنی سوچ کو پھیلانے کی کوشش کرتے ھیں۔ اگر کوئی ڈاکو کسی کے گھر جا کر لوٹ مار کرے، ان کی عزتوں پر دست درازی کرے، پکڑا جائے اور کوئی اس کی حمایت کرے، تو انصاف کی رو سے وہ ڈاکو اور اس کا حمایتی دونوں ھی مجرم ھیں۔ یہ تمام دنیا میں رائج قانون ھے، انصاف ھے، اخلاق ھے۔ اس ڈاکو کو اور اس ڈاکو کے حمایتیوں کو چھوٹ دینا تمام معاشرے کے ساتھ ظلم کرنا ھے اور اس ڈاکو اور اس کے حمایتیوں کو سزا دینا، عبرت بنانا تمام معاشرے کا تحفظ ھے۔ یہ انصاف کا تقاضا ھے کہ فساد پیدا کرنے والے فسادی کو ختم کر دیا جائے ورنہ وہ فساد پھیلائے گا، اور فساد کی آگ میں تمام معاشرہ جلے گا اور حضرات انبیاء کرام علیھم السلام کی گستاخی تو ایک عظیم فتنہ اور فساد ھے۔ قرآن پاک پڑھ کر دیکھیں، کچھ منافقین نے مسجد ضرار بنائی تھی، ان چند لوگوں کا شمار مسلمانوں میں ھوتا تھا۔ حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم پر وحی آتی تھی، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے حبیب حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کرتے تھے، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے حکم کے مطابق کرتے تھے۔ چنانچہ آیت نازل ہوئی اور ان منافقین کا پردہ فاش ہو گیا۔ چنانچہ حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حکم دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق مسجد ضرار گرا کر جلا دی گئی۔ بے ادبوں کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکال دیا گیا، آنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ جو اللہ تعالیٰ جلّ شانہ چاہتا تھا پیارے حبیب، حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ وھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے حبیب حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کرتے تھے، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے حکم کے مطابق کرتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان کیا گیا لیکن گستاخوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیا گیا۔ کوئی اپنے ماں باپ، بہن بیوی، بزرگ کے بارے میں کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کو بھی اپنے حبیب حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور انبیاء علیہم السلام کی گستاخی گوارا نہیں۔ فرشتوں کا سردار بھی اسی لئے مقرب سے مردود بن گیا۔ حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان، مال اور ھر رشتے سے زیادہ محبوب رکھنا ھی ایمان ھے۔ مسلمانوں کو بھی اپنے محبوب پاک، حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور کسی بھی نبی علیہ السلام کی گستاخی گوارا نہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ

تعالیٰ عنہ نے جب ایک مسلمان کو حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے انکار کرتا ھوا پایا تو اسے قتل کر دیا اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی بارگاہ میں آپ کا یہ عمل اتنا پسندیدہ ٹھرا کہ تائید اور حمایت میں آیت نازل ھو گئی۔ گستاخ کو قتل کرنا فساد اور فتنے کو ختم کرنا ھے اور گستاخ کو شرعی تقاضوں کو پورا کرتے ھوئے پوری جانچ کے بعد قتل کرنا پورے معاشرے کا فساد اور فتنے سے تحفظ ھے۔ یہ عین انصاف اور اخلاق ھے۔ صحابہ کرام علیھم الرضوان قرآن و سنت کے سچے پیروکار تھے۔ حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف ھے " میرے صحابہ ستاروں کی مانند "ھیں، کسی ایک کی پیروی کر لو ھدایت پا جاؤ گے۔

ان صحابہ علیھم الرضوان کا قرآن و سنت کے سچھ پیروکاروں کا طریقہ ملاحظہ کریں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ماموں کی گردن ماری۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے باپ کو قتل کیا اور بے شمار مثالیں ھیں۔ لوگ اپنے گھر والوں ،بڑوں لیڈروں کی عزت پر حملہ برداشت نہیں کرتے۔ اسلام کی عمارت تو عشق حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ھی قائم ھے۔ اگر کوئی حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر حملہ کرے، اگر اس کے ساتھ نرمی کی جائے تو اسلام کیسے قائم رھے گا۔ حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں بھی اسلام کو

مٹانے ھی کیلئے کی جاتی ھیں۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کو اپنے انبیاء علیھم السلام کی شان میں گستاخی قبول ھی نہیں۔ فرعون نے خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ بے نیاز ھے۔ فرعون نے جو چاھا کرتا رھا، لیکن جیسے ھی اس نے اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے نبی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کی، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے اسے سزا دی وہ غرق ھو گیا اور عبرت بن گیا۔ انبیاء علیھم السلام کی شان کے تو کیا ھی کہنے ھیں، اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے تو اپنے ولیوں کے ساتھ عداوت رکھنے والوں کے ساتھ اعلان جنگ کیا ھے۔ ھم اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی اطاعت کرتے ھیں۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ھمیں دین اسلام عطا فرمایا ھے، اسلامی قانون یہی ھے کہ تمام انبیاء علیھم السلام کی گستاخی بالکل بھی گوارا نہیں ھے، گستاخی کی سزا موت ھے۔ ناموس رسالت کا قانون تو تمام انبیاء علیھم السلام کی شانوں کا تحفظ کرتا ھے۔ لیکن کیونکہ حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیھم السلام کے امام ھیں، سردار ھیں اس لئے ناموس رسالت کا قانون حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا جاتا ھے۔ یہ امتیازی قانون نہیں۔ یہ وہ قانون ھے، جو انصاف کی بنیاد ھے، جس کی وجہ سے انصاف ھے۔ تمام کائنات کے مالک جل جلالہ کے بھیجے ھوئے پیغمبروں کی گستاخی کی اگر چھوٹ دے دی جائے، گستاخ کی سزا کا قانون ختم کر دیا جائے اور چھوٹ کا نام سزا رکھ کر گستاخ کو چھوٹ دے دی جائے جیسا کہ

گستاخوں کے حمایتی لوگ چاہتے ھیں تو پھر دین کی عمارت کیسے قائم رھے گی۔ انصاف کا کیا مطلب سمجھا جائے گا۔ عجیب سی بات ھو گی کہ کسی عام شخص پر دست درازی کرنے والے کو تو سزا ملے، کسی سیاسی لیڈر کو جوتی مارنے پر یا اس کی تصویر کو کوئی جلا دے تو ھنگامے ھوں، کسی شخص کی عزت پر حملہ کرنے والے کیلئے تو قانون حرکت میں آ جائے اور انبیاء کرام علیھم السلام کی عصمتوں پر حملے کرنے والے کو آزاد چھوڑ دیا جائے، تو پھر اس دنیا سے انصاف تو ختم ھی ھو جائے گا۔ توبہ نعوذ باللہ۔ جل جلالہ۔ ھر دور میں دین انھیں انبیاء علیھم السلام کے ذریعے قائم ھوا ھے۔ اسلام کی بقا، اسلام کا تحفظ، توحید کی بقا، حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم میں ھے۔ توریت عہد نامہ قدیم کے نسخے میں آج بھی یہ بات موجود ھے کہ اگر کوئی شخص قاضی جج) کی یا کاھن کی جو لوگوں کو استخارے کرکے دیتا ھے، ان کی توھین کرے، تو اسے) قتل کر دیا جائے گا۔ اور کٹر وڑھا قاضی بھی انبیاء کرام علیھم السلام کے نعلین کی دھول کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ناموس رسالت کا قانون تمام انبیاء علیھم السلام کی عصمت کا تحفظ کرتا ھے۔ اس دنیا میں ایک عام سے عام آدمی کی عزت کے تحفظ کا بھی قانون موجود ھے، قاضی اور کاھن کے گستاخ کے لئے قتل کی سزا تو توریت میں موجود ھے، تو پھر صرف ناموس رسالت کے قانون ھی میں تبدیلی کی بات کیوں کی جاتی ھے۔ صرف اس لئے کہ شان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں نقب لگانے کی کوشش اسلام کو ختم کرنے کیلئے کی جاتی ھے۔ بار

بار حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ھی گستاخی کیوں کی جاتی ھے، کبھی خاکے بنائے جاتے ھیں، کبھی فیس بک پر گستاخی کا دن منایا جاتا ھے، کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ صرف اس لئے کہ اسلام کو مٹانا، ختم کرنا مقصود ھے اور ایسا ھو ھی نہیں سکتا، ایسا تو ممکن ھی نہیں ھے۔ اللہ تعالی جلّ شانہ نے تمام حضرات انبیاء کرام علیھم السلام کو اعلی مقامات عطا فرمائے ھیں، کوئی ان کو کم نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالی جلّ شانہ نے پیارے محبوب کریم، حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑھ کر مقام اور شان عطا فرمائی ھے، اس کو کوئی کم نہیں کر سکتا۔ کسی کی ماں، بہن، باپ کو یا کسی بڑے کو گالی دی جائے، تو وہ لال پیلا ھو جاتا ھے۔ تمام انبیاء کے امام، سردار اور تمام مسلمانوں کے محبوب، حضور پر نور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی پر مسلمانوں کا جذباتی ھونا ایک فطری امر ھے، گستاخ کو قتل کرنے سے پہلے قانون کے تقاضوں کے مطابق، انصاف کرتے ھوئے تحقیق کی جائے اور جرم ثابت ھونے پر پھانسی کی سزا دی جائے، تو اخلاقیات اور تشدد کا نام لے کر جھوٹا شور مچا دیا جاتا ھے۔ آخر کیوں۔ کوئی کہتا ھے ناموس رسالت کا قانون صرف اقلیتوں کو نشانہ بناتا ھے۔ آخر یہ جھوٹ کیوں بولا جاتا ھے۔ ناموس رسالت کے قانون کے مطابق تو اگر کوئی کلمہ گو مسلمان کہلانے والا بھی اگر کسی بھی نبی علیہ السلام کی گستاخی کرے گا، تو اس کے لئے بھی وھی سزا ھے جو غیر مسلموں کیلئے۔ کتنی مکاری سے کہتے ھیں کہ ذمی ٹیکس دیتے ھیں، ان

کے ساتھ تشدد نہیں ہونا چاہئے۔ ذمی ٹیکس دیتے ہیں تو ان سے عہد یہی ہے کہ ان کی جان، مال، اولاد، عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی، اور یہ بھی مسلمانوں کی طرح آزادی سے زندگی گزارنے کے حقدار ہیں، لیکن صرف اس وقت تک جبتک جسطرح ان کی ضروریات کا خیال رکھا جا رہا ہے، یہ بھی مسلمانوں کی ضروریات کا خیال رکھیں گے۔ ان کو مذہبی آزادی حاصل ہے تو یہ بھی شعائر اسلام کا احترام کریں گے۔ ان کو ہرگز یہ اجازت نہیں ہے کہ یہ ٹیکس دے کر اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کو گالیاں دیں، حضور پرنور، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توھین کریں، قرآن پاک کو پاؤں تلے روندیں۔ ذمی تو ذمی، اگر کوئی مسلمان بھی گستاخی کا مرتکب پایا جائے گا، وہ بھی واجب القتل ہو گا۔ لہٰذا ناموس رسالت کے قرآنی قانون میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس قانون کا تحفظ ہر کلمہ گو مسلمان پر فرض ہے اور یہ ارباب اختیار کی ذمہ داری ہے کہ کوئی مسلم ہو یا غیر مسلم، اس قانون کی آڑ میں کسی پر گستاخی کا جھوٹا الزام نہ لگایا جائے۔ کسی پر یہ الزام ہونے کی صورت میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جائے، منصفانہ جانچ کی جائے اور اگر کوئی کسی پر جھوٹا الزام لگائے، تو اسے بھی کڑی سزا دے کر عبرت بنا دیا جائے۔ میڈیا کے مطابق آسیہ کو پوری تفتیش کے بعد عدالت سے سزا دی گئی ہے، اگر یہ سچ ہے اور آسیہ حقیقتاً گستاخ ہی ہے تو شریعت کے مطابق ہی فیصلہ کیا جائے۔

(کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم

یہ جہاں چیز ھے کیا لوح و قلم تیرے ھیں

شادی سے مت بھاگیں

اگر لکھنے والا کسی مسئلے کی نشاندھی کرے، سچ لکھ دے اور تو پڑھنے والوں کو اس سے فائدہ بھی ھوتا ھے اور انھیں اچھا بھی لگتا ھے۔ اگر عمر گزری جا رھی ھے اور آپ کی شادی نہیں ھو پا رھی، آپ کی شادی ھو کر ختم ھو گئی ھے، یا آپ کی ذمہ داری میں یا آپ کے ارد گرد کوئی ایسا ھے جس کی شادی میں آپ کی اخلاقی مدد کی ضرورت ھے تو پھر آپ سارا کالم ضرور پڑھیں۔ امید ھے، یہ پڑھنا بھلائی کا سبب بنے گا اور اسطرح میرے لکھنے کا مقصد پورا ھو گا۔۔

کسی کی کہانی ان کی اپنی زبانی پیش ھے۔ کہتے ھیں کہ شادی کی عمر تھی، مجھے ایک ایسی لڑکی شادی کیلئے اچھی لگی، جس سے نہ تو کبھی بات ھوئی تھی، نہ اس سے کوئی شناسائی تھی، لیکن اس کے حالات سے آگاھی تھی۔ وہ نہایت ھی قریبی یک جان، دو قالب والے دوست کی کزن تھی۔ ایک امریکہ پلٹ شخص سے شادی ھوئی۔ شادی کے کچھ دن بعد موصوف امریکہ واپس چلے گئے اور جا کر طلاق بھیج دی اور معذرت بھی کہ میں یہاں شادی شدہ ھوں، گھر والوں نے پاکستان میں زبردستی شادی کر دی تھی۔ اس لڑکی کی ایک بیٹی تھی۔ مجھے بیٹیاں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن یہاں شادی کیلئے میری فیملی اور میرے دوست کی فیملی نہ مانی اور میری شادی ایک

ایسی لڑکی سے ہو گئی جس نے اپنے گھر والوں کی پابندیوں سے فرار کیلئے شادی کی تھی، اس کا پہلے ھی سے کسی لڑکے سے میل ملاپ تھا۔ مجھ سے شادی ہوئی تو اس نے مجھ سے اسے آزاد کرنے کی اور اس کی دوسری شادی میں رکاوٹ نہ ڈالنے کی بات کی۔ میں نے اس کے ساتھ کافی سر کھپانے کے بعد اسے طلاق دے کر آزاد کر دیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے جلن سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے کچھ عرصے بعد سر بھاری بھاری رہنے لگا۔ مجھے غصہ بہت آنے لگا۔ میرا دماغ ایسا ہو گیا کہ لکھنے پڑھنے کا کام مجھ سے ہوتا ھی نہ تھا۔ طبیعت بوجھل بوجھل سی رہنے لگی۔ کچھ بھی کام کرنے لگتا تو ڈھنگ سے نہ کر پاتا۔ طبیعت پر عجیب سے افسردگی سے چھانے لگی۔ جوں توں اپنا وقت گزارتا رہا۔ پھر ایسا ہو گیا کہ مجھ سے نماز پڑھنا مشکل ہو گئی۔۔ میرے جسم میں خشکی بہت پیدا ہو گئی۔ جب لوگ پیاس لگنے پر ایک گلاس پانی پیتے میں پوری ایک لیٹر کی بوتل پی جاتا۔ عجیب حالت تھی۔ وسوسے بہت تنگ کرنے لگے۔ میں نے بہت ڈاکٹروں کے پاس چکر لگائے، لیکن میرے سب ٹیسٹ نارمل تھے۔ میں ایک عذاب میں پڑ گیا تھا۔ میں نہاتا تو نہاتا ھی چلا جاتا۔ مجھے یوں لگتا کہ جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ھے۔ میں سخت تکلیف میں تھا۔ کچھ ڈاکٹر کہتے تھے کہ آپ شادی کر لیں، ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن مجھے اس بات کی کچھ سمجھ نہیں آتی تھی، اس وقت اس بات کا بالکل علم نہیں تھا، میں سوچتا تھا کیا جن کی شادی نہیں ہوتی وہ سب میری طرح بیمار ہو جاتے ھیں۔ میں نے اپنے آپ کو آفس کے کام میں مصروف کر لیا۔ مجھے پانچ بجے

چھٹی ہو جاتی لیکن میں رات آٹھ یا نو بجے تک کام کرتا رہتا۔ مجھے کام سے سکون رہتا تھا اور اس کے بعد وہی عذاب۔

میں بہت پریشان تھا اور اپنے حال سے میں اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ اسی دوران میرے ساتھ ایک اہم واقعہ ہوا۔ میں نے اپنے جاننے والوں میں ایک لڑکی کو پاگل پن کے دورے پڑتے دیکھے اور مجھے پتہ چلا کہ اس کی عمر زیادہ ہو گئی تھی اور شادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی حالت خراب تھی۔ معالجوں نے یہی کہا کہ جلد سے جلد اس کی شادی کر دیں۔ اس کے گھر والوں نے اس کی شادی کر دی اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ اس وقت مجھے بھی یہ بات سمجھ آنے لگی کہ ہو نہ ہو میری پریشانیوں کا تعلق بھی میری شادی نہ ہونے ہی سے ہے۔ میں روزانہ صبح تقریباً آٹھ، دس کلومیٹر سیر کیا کرتا تھا۔ مجھے اس سے کافی فائدہ ہوتا تھا اور جب کبھی میں کچھ دن سیر کرنا چھوڑ دیتا، میری حالت بگڑنا شروع ہو جاتی۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ میرے کام ایسا تھا کہ میرا ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا تھا۔ کچھ ڈاکٹر اور نامی گرامی حکیم میرے اچھے واقف بن چکے تھے۔ میں نے ان سے تعلقات بڑھائے اور اپنے کام کے علاوہ کا وقت ان کے ساتھ گزارتا۔ مطالعے کے دوران میں نے دو روایات پڑھیں۔ ایک یہ کہ نکاح کے بغیر وسوسوں سے بچنا بہت مشکل ہے اور دوسری یہ کہ شب جمعہ کو (جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شپ) اپنی بیوی سے صحبت کرو تاکہ تم اگلے دن دل جمعی کے ساتھ

نماز جمعہ پڑھ سکو اور تمہاری بیوی بھی دل جمعی سے نماز پڑھ سکے۔ اب مجھے بہت آگاھی ھو چکی تھی۔ میری شادی ختم ھونے کے بعد دوبارہ شادی نہ ھونا میرے لئے ایک مصیبت بنتا جا رھا تھا۔ میں اب کافی ڈر چکا تھا کہ اگر یہ سلسلہ بڑھتا رھا تو کیا ھو گا۔ لیکن اب مجھے کافی علم ھو چکا تھا اور آخر کار میری ان تکلیفوں سے جان چھوٹ ھی گئی۔ میں sexual disorder کا شکار ھو رھا تھا۔ آپ کو طبّی نکتہ نظر سے بھی بتاتا ھوں۔ میں یہ وہ بیماری ھے جو شادی کی عمر میں پہنچ جانے والوں کو شادی نہ ھونے کی صورت میں اپنی لپیٹ میں لیتی ھے لیکن شدت کم ھونے کی وجہ سے اسے محسوس نہیں کیا جاتا اور ھر کوئی نیک نہیں ھوتا۔ منفی ذرائع سے اپنی تسکین کرنے کے بعد اس بیماری سے بچاؤ رھتا ھے۔ لیکن وہ لوگ جن کی شادی ھو اور پھر علیحدگی ھو جائے، ان کا اس بیماری سے بچنا دشوار ھے۔ یا تو وہ کسی بھی ذریعے سے اپنی جنسی تسکین کریں گے یا پھر آھستہ آھستہ اس بیماری کا شکار ھوتے چلے جائیں گے اور اگر اس بیماری کی شدت بڑھ جائے تو ابنارمل جیسے بھی نظر آ سکتے ھیں اور ایک تیسرا راستہ بھی ھے جو ھمارے مذھب اسلام میں بتایا گیا ھے، وہ ھے روزے رکھنا۔ اپنی خوراک کو کم کر کے شہوانی جذبات کا رد کرنا۔۔ لہٰذا میرے پاس ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں شادی کر لوں۔ جو کہ مختلف وجوہات کی بنیاد پر ممکن نہ ھو سکتا تھا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ اپنے منہ پر بدی کی کالک مل لوں اور اپنی جنسی تسکین کیلئے معاشرے میں پھیلی برائیوں میں ایک برائی اور بن جاؤں۔ میرے جیسے بندے

کیلئے کسی بھی قیمت پر ایسا کرنا نہ پہلے ممکن رہا اور نہ کبھی ہو گا۔ اس برائی سے ہر قیمت پر دوری ہی بہتر ہے۔ میں روزے تو نہ رکھ سکا، کیونکہ آفس میں میرا کام بہت ذمہ داری کا تھا اور میں روزانہ ایک لمبی سیر بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن میری خوش قسمتی کہ اسباب بنتے گئے اور آج میں اس بیماری کے اثرات کو ایک گزرے وقت کی طرح بتا رہا ہوں۔ ایک بزرگ نے یہ وظیفہ بتایا کہ جب سونے لگو تو درود پاک پڑھو اور اللہ تعالی ﷻ جلّ شانہ کا نام پاک " یا مُمِیتُ " پڑھتے پڑھتے سو جایا کرو۔ اس مبارک وظیفے کی برکت سے میری طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا۔ میں نے کھانا دو وقت کھانا شروع کر دیا اور بھوک رکھ کر کھانے کی سنت پر عمل شروع کر دیا۔ دوپہر کا کھانا چھوڑنا شروع میں تھوڑا عجیب لگا، لیکن پھر عادی ہو گیا۔ اگر دوپہر کو بھوک تنگ کرتی تو کچھ بھی ہلکا پھلکا کھا لیتا۔ گوشت، انڈا، گرم چیزیں چائے وغیرہ سے پرھیز کرتا۔ حکیم کی دوائی بھی استعمال کی۔ لیکن اس سب کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ شادی ایک فطری تقاضا ھے، اسے پورا کریں۔

آپ نے یہ ساری کہانی پڑھی، ایک بات بڑی واضح ھے کہ شادی کی عمر میں شادی نہ ہونا اور شادی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد شادی نہ ہونا، یہ دونوں باتیں ایسی ھیں کہ کمزور ایمان کے لوگوں یا کم علم لوگوں کے ایسی حالت میں گناہ کی دلدل میں دھنسنے کے بہت قوی امکانات ھیں اور کتنے ایسے ھوں گے جن کو روزے

رکھ کر، کم کھا کر اپنے آپ کو سنبھالنا آتا ھوگا۔ایسی صورت میں بیماری کی شدت بڑھنے کے بہت زیادہ امکانات ھیں۔

اور طبّی نکتہ نظر سے عورتوں میں مردوں کی نسبت اس طرح کی پیچیدگیاں پیدا ھونے کے زیادہ امکانات ھیں۔ لہٰذا شادی کی عمر ھو جائے تو شادی میں دیر نہ کیجئے اور اگر کسی کی شادی کسی وجہ سے ختم ھو جائے تو دوبارہ شادی کرنے یا کروانے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا دیر نہ کیجئے۔

نادرا سمن آباد لاھور کی کرشمہ سازیاں

بہت عرصے سے پاکستانی عوام پر لتروں (جوتوں) کی بارش جاری ھے اور ھماری بہادر عوام کیونکہ تیونس کے عوام کی طرح بے صبری نہیں ھے، اس لئے یہ بہادر عوام بڑی ھمت اور صبر کے ساتھ اس بارش میں نہانے میں مصروف ھے۔ قارئین کی راھنمائی اور مدد کیلئے، نادرا سمن آباد لاھور کے دفتر سے برستی بارش میں نہاتے ایک درخوست گزار کا حال پیش ھے۔ برائے مہربانی مسکرائیں ضرور لیکن اس سے تجربہ حاصل کریں اور جب بھی نادرا کے دفتر جائیں، نادرا کے آفس میں موجود سٹاف کی عزت اور احترام کرکے ان کو بھرپور سروس فراہم کریں اور اس بات کی پروا بالکل نہ کریں، کہ سروس فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ھے اور اس کام کی آپ کے ٹیکسوں سے یہ لوگ تنخواہ بھی پاتے ھیں۔ ورنہ آپ کا حال بھی اس درخوست گزار جیسا ھو سکتا ھے۔

13 اکتوبر 2010 کو ایک سائل نادرا سمن آباد آفس اپنے شناختی کارڈ کی تجدید کیلئے جا پہنچا۔ اسے وھاں سے پتہ چلا کہ لائن میں لگنے کی بجائے سامنے موجود مبینہ دوکاندار جس کا دکھاوے کا کام کچھ اور ھے، لیکن دراصل وہ نادرا سمن آباد کے سٹاف کا ایجنٹ ھے اور 1000 روپے دے کر بغیر لائن میں لگے کچھ دنوں میں شناختی کارڈ بنوا دیتا ھے، اگر اس سے رابطہ کیا جائے تو سارا کام

وہیں آسانی سے ہو جائے گا۔ ۔ وھیں بیٹھے بیٹھے موبائل سے تصویر لینے کی بھی سہولت موجود ھے۔ لیکن لتر بارش میں نہانا اس کا مقدر تھا۔ اس نے اپنے پیسے بچائے، نادرا ھیڈ آفس سے آئی گاڑی میں مورخہ 13 اکتوبر 2010 کو 200 روپے سرکاری خزانے 500016684 فارم نمبر حاصل کیا اور گھر چلا گیا۔ کچھ دن بعد Y میں جمع کروا کر متعلقہ سرکاری آفیسر سے تصدیق کروا کر جب یہ واپس دفتر پہنچا تو فارم جمع کروانے کیلئے کھڑکی نمبر 3 پر لمبی لائن میں کھڑا ھو گیا۔ لیکن جب طویل انتظار کے بعد اس کی باری آئی تو کھڑکی بند ھو گئی۔ آفس سے بتایا گیا کہ لائٹ چلی گئی ھے، جنریٹر میں تیل نہیں ھے، انتظار کریں۔ انتظار کرنے کے بعد جب باری آئی تو کھڑکی نمبر 3 پر موجود آفیسر اپنی کرسی چھوڑ کر آفس میں غائب ھو گئے۔ چھوٹی سے کھڑکی سے تلاش کرنے کے بہت دیر بعد فون پر بات کرتے پائے گئے۔ جب ان کا دل کیا، وہ واپس آئے، درخواست گزار نے گلہ کیا کہ ھم صبح سے لائن میں ھیں اور آپ ھمیں کھڑا کر کے فون سننے میں مصروف ھیں۔ بس محترم آفیسر صاحب کا بلڈ پریشر ھائی ھو گیا۔ حکم فرمایا کہ آپ زیادہ باتیں نہ کریں اور فارم جمع کروائیں۔ آفیسر نے حکم فرمایا کہ اپنے والد اور والدہ کا شناختی کارڈ دکھائیں۔ دوسروں سے کارڈ کی تجدید کیلئے کا تقاضہ نہیں کیا جا رھا تھا، لیکن یہ درخواست گزار کے شکوے کی سزا تھی۔ درخواست گزار نے دبی دبی آواز میں موصوف آفیسر کو بتایا بھی کہ والد، والدہ کے شناختی کارڈ تو پہلی حاضری پر چیک کئے جا چکے ھیں لیکن انھوں نے اگلے

بندے کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔ درخواست گزار اپنے گھر سے والد، والدہ کے شناختی کارڈ لے کر واپس دفتر آ کر دوبارہ لائن میں لگ گیا۔ جب اس کی باری آئی تو کھڑکی پر موجود آفیسر نے ان کی شناخت کر لی۔ فرمایا کہ صبح آپ ھی میرے فون سننے پر شور مچا رھے تھے ؟ سر، آپ نے فون سننے پر گھنٹہ لگا دیا تھا، میں نے تو آپ سے صرف بات کی تھی کہ صبح سے لائن میں کھڑے ھیں، فارم جمع کر لیں۔ درخواست گزار نے جواب پیش کیا اور اپنا فارم پکڑا دیا۔ آفیسر نے فارم دیکھا اور واپس درخوست گزار کے ھاتھ میں پکڑا دیا اور فرمایا آپ واپس گھر جائیں اور میٹرک کی سند لے کر آئیں اور لائن میں لگ کر دوبارہ میرے پاس آئیں۔ درخواست گزار سمجھ گیا کہ اسے سزا دی جا رھی ھے۔ درخوست گزار نے فارم پکڑا اور گارڈ کی نہایت منت سماجت کرنے کے بعد آفس انچارج تک جا پہنچا۔ آفس انچارج کا کہنا تھا کہ کارڈ کی تجدید کیلئے میٹرک کی سند کی ضرورت نہیں ھے، آپ ان کو جا کر میرا حوالہ دیں، وہ فارم جمع کر لیں گے۔ درخوست گزار متعلقہ آفیسر کے پاس حاضر ھوا اور اسے اس کے انچارج کا حکم سنایا۔ موصوف نے فرمایا، ٹھیک ھے آپ لائن میں آئیں میں آپ کا فارم جمع کر لیتا ھوں۔ چنانچہ درخوست گزار دوبارہ لائن میں لگ کر کھڑکی پر پہنچا تو موصوف دوبارہ فون پر مصروف ھو گئے۔ درخواست گزار دوبارہ آفس انچارج کے پاس پہنچ گیا۔ آفس انچارج نے انھیں ایک خاتون آفیسر کے پاس بھیج دیا۔ اس خاتون آفیسر نے انھیں لائن میں لگ کر آنے کا کہا۔ درخوست گزار نے انکار کیا اور اسے بتایا کہ صبح

سے یہی کر رہا ھوں۔ تو اس نے انتظار کرنے کا کہا۔ آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد درخواست گزار نے پھر فارم جمع کرنے کا اصرار کیا تو خاتون نے دوبارہ انتظار کرنے کا کہا۔ کیا میں میڈیا والوں کو بلا کر لاؤں تو میرا فارم پھر جمع ھوگا یا عدالت میں درخواست دوں۔ درخوست گزار زچ ھو کر بولا۔ یہ سن کر خاتون آفیسر لال پیلی ھو گئیں۔ میں نے بڑے صحافی دیکھے ھیں۔ جس کو مرضی بلا لاؤ۔ ،میں نے فارم جمع نہیں کرنا۔ کھڑکی نمبر تین پر ھی جا کر جمع کرواؤ۔ درخواست گزار دوبارہ کھڑکی نمبر تین پر لائن پر لگ گیا، لیکن جب باری آئی تو متعلقہ آفیسر نے فارم جمع کرنے سے انکار کر دیا۔ درخواست گزار نے اصرار کیا تو متعلقہ آفیسر نے اسے بتایا کہ اس کا کارڈ نہیں بن سکتا۔ وہ گھر جائے اور شور مچانے کی کوشش نہ کرے۔ درخوست گزار دوبارہ آفس انچارج کے پاس پہنچا اور اس نے اپنے آفس بوائے کو بھیج کر فارم جمع کروا دیا اور آفس سٹاف کی طرف سے معذرت کی ۔آفس بوائے نے درخواست گزار کو رسید لا کر دی اور اسے یاد کروایا کہ اگر وہ فوٹو کاپی والے کے پاس جا کر 1000 روپیہ جمع کروا دیتا تو اتنا مسئلہ نہیں ھوتا، اب بھی وہاں چلا جائے ورنہ کارڈ اب بھی نہیں بنے گا۔ یہ نہایت ھی باخبر آفس بوائے تھا۔ لیکن درخواست گزار رسید لے کر گھر آ گیا۔ رسید کے مطابق 5 جنوری کو شناختی کارڈ ملنا تھا، لیکن 5 تاریخ تک اس ناردا سمن آباد آفس سے متعلقہ 2011 کارڈ کا ڈیٹا اسلام آباد کیلئے اپ لوڈ ہی نہیں کیا گیا تھا اور درخواست گزار تا حال نادرا کے آفس کے چکر لگانے میں

مصروف ھے۔ آفس بوائے نے درست ھی فرمایا تھا۔ شناختی کارڈ کے نہ ھونے سے اس درخواست گزار کے بینکنگ کے اور دوسرے متعلقہ کام رک گئے ھیں۔ درخواست گزار نے آخر کار تنگ آ کر شناختی کارڈ کے حصول کیلئے عدالت میں درخواست دی ھے۔

ذرا سی کوشش کے بعد مجھے بے شمار لوگ ملے جو نادرا سمن آباد لاھور کے بے حس سٹاف کی لاپروائیوں کی وجہ سے اپنے شناختی کارڈ کے حصول کیلئے دھکے کھا رھے ھیں۔

شناختی کارڈ کیلئے فارم جمع کروا کر ایک رسید ملتی ھے، میرے تک پہنچنے والی رسید پر ایک یونیورسل فون نمبر کے ساتھ یہ بھی لکھا ھے کہ آنے سے پہلے اس فون نمبر پر رابطہ کریں، یہ فون نمبر ملتا ھی نہیں لہٰذا عوام اپنے کام کاج چھوڑ کر دفتر آ کر لمبی لمبی لائنوں میں لگنے میں مجبور ھے اور اتنی دیر لائن میں لگنے کے باوجود انھیں یہ کہا جاتا ھے کچھ دن بعد پتہ کریں۔ کوئی حتمی تاریخ نہیں دی جاتی اور دوبارہ پھر وھی چکر پر چکر۔ اسی فون کے نہ ملنے کے بارے میں وفاقی محتسب کی عدالت میں ایک مقدمہ نمبر۔11 او۔این۔ایل زیر سماعت ھے۔0000069

شناختی کارڈ تب ملتا ھے کہ جب اس شخص کو اچھی طرح یہ باور کروا دیا جاتا ھے کہ وہ عوام میں سے ھے اور عوام کو ذلیل خوار کرنا نادرا سمن آباد کے سٹاف

کا حق ھے اور انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں ھے۔

شناختی کارڈ کیلئے فارم جمع کروا کر ملنے والی جو رسید میرے پاس پہنچی ھے اس پر لکھا ھے کہ شناختی کارڈ 15 دن کے بعد نادرا دفتر سے حاصل کیا جا سکتا ھے لیکن آپ ملاحظہ کریں کہ محمد ندیم فارم نمبر 000022931 ایف ۔۔۔۔ نے 24 نومبر 2010 کو فارم جمع کروایا لیکن 26 جنوری 2011 تک بھی ان کو کارڈ نہیں ملا۔

قاسم 100062063 ایف ۔ نے 23 ستمبر 2010 کو فارم جمع کروایا لیکن 26 جنوری 20100 تک کارڈ حاصل نہیں کر سکا۔

اعجاز علی 12 فارم نمبر 00662640 ایل ایس ۔۔ اکتوبر 2010 کو فارم جمع کروا کر جنوری 2011 تک کارڈ حاصل نہیں کر سکا۔ 26

فیاض مسیح فارم نمبر 005566467 ایل ایس 25 فروری 2010 کو فارم جمع کروا کر جنوری 2011 تک بھی شناختی کارڈ حاصل نہیں کر سکا۔26

اور ایک خطرناک بات یہ ھے کہ میں نے ذرا سی کوشش سے ایک ایسے درخواست گزار سے بھی رابطہ ھو گیا جنھوں نے لمبی لمبی لائنوں سے تنگ آ کر اسی مہینہ

ایجنٹ کو صرف 1000 روپے دے کر اپنا کارڈ حاصل کیا ھے اور ظاھر ھے یہ پیسے اور اس طرح کی دوسری فیسیں سرکاری خزانے کی بجائے سٹاف اور ایجنٹ صاحب کی جیب میں گئی ھوں گی۔

محترم قارئین، ایک بھری دیگ میں سے کسی پکوان کا ذائقہ جاننے کیلئے ایک لقمہ ھی کافی ھوتا ھے۔ ھم نے تو کئی لقمے لے کر دیکھا، کہ نادرا سمن آباد آفس کے سٹاف کا رویہ اور اس دفتر کے حالات اس بات کی گواہی دے رھے ھیں کہ یہ محکمہ بھی بے بس اور مجبور عوام کو ذلیل و خوار کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ھے اور عوام کو سروس فراہم کرنے کے نام پر عوام سے پیسے لے کر عوام کو شناختی کارڈ فراہم کرنے کا کام جاری ھے لیکن مہنگائی کی ماری عوام کو ذلیل و خوار کرنے کے بعد۔ اور ایک کڑوا سچ یہ ھے کہ نہ جانے نادرا آفس کے سامنے موجود مبینہ غیر قانونی ایجنٹ کو نادرا آفس سے کتنے اختیارات مل چکے ھیں، اور جعلی کوائف کے ذریعے نہ جانے کتنے نوسرباز اصلی شناختی کارڈ حاصل کر چکے ھیں اور کیا کرتے پھر رھے ھوں۔ کیا معلوم کہ کوئی دہشت گرد بھی اس سہولت سے استفادہ حاصل کر چکا ھو۔

بہر حال نادرا سمن آباد لاھور کو ان کی کرشمہ سازیاں مبارک ھوں۔

ٹھرک کا کاروبار

جن لوگوں نے یہ ملک بنایا تھا وہ بڑے عظیم لوگ تھے۔ لیکن جو ان کے وارث تھے آپ کے اور میرے بڑے۔ یہ وہ لوگ ھیں (سارے نہیں لیکن اکثر) جنھوں نے اس ملک کا بیڑا غرق کر دیا۔ ملک کو چھوڑ کر اپنے ایجنڈوں میں الجھ گئے اور نتیجتاً اپنے ساتھ ساتھ ملک کا بھی ستیاناس کر دیا۔ ان لوگوں نے نہ ورثے کی حفاظت کی اور نہ کچھ کمایا، اس لئے اگلی نسل کو بھی کچھ نہ منتقل کر سکے۔ ان کے کارنامے بہت لمبے ھیں لیکن آج کا موضوع ٹھرک کا کاروبار ھے جو ان ھی لوگوں میں سے موجودہ نسل کو منتقل ھوا ھے، آج بھی اس کاروبار میں زیادہ حصہ ان لوگوں کا ھے اور اب کافی بڑھتا نظر آ رھا ھے۔ اس کاروبار کے کرنے والے مختلف لوگوں کی چند قسمیں درج ذیل ھیں۔

1۔ بوڑھے لوگوں کا بہت احترام ھے اور ان کی بے شمار برکتیں ھیں لیکن سارے بوڑھے ایک جیسے نہیں۔ اچھوں کے گمان میں برے بوڑھوں کا شکار ھونا اور برے بوڑھوں کے چکر میں اچھے بوڑھوں کی برکت سے محروم ھونا دونوں ھی نقصان دہ عمل ھیں۔

2۔اور ان بوڑھوں میں سے کچھ کچھ لوگ بڑی کامیابی سے اپنے بڑھاپے کی آڑ میں ٹھرک کا کاروبار کرتے ھیں اور اپنے بڑھاپے اور ظاھری بزرگی کی وجہ سے کبھی پکڑے نہیں جاتے ۔ یہ وہ لوگ ھیں جو کسی بھی لڑکی کو بیٹی سمجھ کر پیار ضرور دیتے ھیں اور ان کا پیار سر پر ھاتھ رکھنے سے شروع ھوتا ھے اور سر سے بیٹی کی کمر پر اس وقت تک نیچے جاتا رھتا ھے جب تک بیٹی کا اس ٹھرک سے آگاہ ھونے کا خطرہ نہ پیدا ھو جائے اور یہ بیٹیاں ایسی ھوتی ھیں کہ کسی دوسرے مرد کی نگاہ غلط کو بھی فوراً محسوس کر لیں لیکن بابا جی کے احترام کے چکر میں کچھ سمجھ نہیں پاتیں۔

3۔لڑکی زیادہ بھولی ھو تو بابا جی ایک کندھے پر ھاتھ رکھ کر اپنے جسم سے لپٹا کر بھی ٹھرک دیتے ھیں یعنی پیار دیتے ھیں۔

4۔اور جہاں یہ سب ممکن نہ ھو اور خاتون اپنی عمر کی یا شادی شدہ ھو تو کچھ مرد حضرات وھاں باجی باجی کہہ کے احترام کے جھانسے میں باتوں اور نظروں سے ھی اپنی ٹھرک پوری کرنے پر اکتفا کرتے ھیں۔

5۔اور کم عمر کے ٹھرکی لڑکوں کو بھونڈ بھی کہتے ھیں۔ یہ وہ صاحبان ھیں جو سکولوں اور کالجوں سے چھٹی کے وقت لڑکیوں کو تاکنے جھانکنے کو اپنا فرض

سمجھ کر پہنچ جاتے ھیں اور اسی تاکنے جھانکنے میں ان کا ٹھرک کا نشہ پورا ھو جاتا ھے۔

6 ۔ انٹرنیٹ پر ٹھرکی لڑکے چیٹ کرنے کیلئے ھر وقت لڑکیاں ھی تلاش کرتے رھتے ھیں۔ اور اس تلاش میں اگر چیٹ رومز میں کوئی لڑکا مل جائے تو یہ فوراً سے بھی پہلے اسے چھوڑ کر بھاگ جاتے ھیں۔ ایسے لوگ فحش سائٹوں کو بڑی باقاعدگی سے وزٹ کرتے ھیں اور ایسے لوگوں نی ھی انٹرنیٹ کو بدنام کر رکھا ھے۔

7 ۔ موبائل ٹھرکی وہ ٹھرکی ھیں جو اپنے روزمرہ وقت کا بہت سارا حصہ لڑکیوں کے فون نمبرز اکٹھے کرنے اور پھر ان کو میسج کرنے میں گزار دیتے ھیں۔

8 ۔ ایسے مرد تو آپ نے ضرور دیکھے ھوں گے جو اپنے دوست کی بیوی کی گھر آمد پر اپنے دوست کی بیوی کی اتنی خاطر مدارت کرتے ھیں، اس کے سامنے بڑھ بڑھ کر چیزیں رکھنے میں اور اس کا حال پوچھنے میں اتنے منہمک ھوجاتے ھیں کہ انھیں یہ خیال ھی نہیں رھتا کہ یہ کام تو ان کی بیوی کو کرنا تھا اور یہ بھی بھول جاتے ھیں کہ انھیں دوست کا بھی حال پوچھنا ھے۔

افسوس کی بات ھے کہ ان ٹھرکیوں کا سارا کاروبار مردوں ھی کی غفلت کی وجہ سے

چلتا ھے۔ مثلاً اگر کسی کی بیٹی بہن یا بیوی کو کوئی بابا بڑھ بڑھ کر میری بیٹی کے نعروں کے ساتھ سر سے نیچے تک اپنے ھاتھ سے پیار دے رھا ھے۔ تو میرے چند دوستوں کے نزدیک قصور تو اس بہن بیوی یا بیٹی کے ساتھ والے مرد کا ھی گنا جائے گا۔ اس کڑوے سچ کو سمجھنا بھی ایک ضرورت بن گیا ھے اور تا کہ اپنے گھروں کی بھولی عورتوں کو ایسی گندگی سے دور رکھا جا سکے۔

پاکستان، سری لنکا میچ اور جادو

وطن عزیز میں بہت سے لوگ پاکستان اور سری لنکا کے میچ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ پاکستان جیت گیا اور لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ ان سب میچ کے شیدائیوں نے کیا کل پانچ وقت نمازیں بھی پڑھیں ھوں گی ؟ سب ایک جیسے تو نہیں۔ لیکن سالوں کا مشاھدہ یہی ھے کہ یہ بات تو کہے پوچھے بغیر ہی سمجھنے والی ھے، کہ اکثر نے نہیں۔ جناب میچ دیکھنا ھے تو دیکھیں لیکن نماز فرض ھے نماز نہ چھوڑیں۔ آپ کو دیکھ کر تو بچے بھی آپ جیسے ہی ھو رھے ھیں۔

پرسوں ٹی وی چینلز پر دکھایا گیا کہ ایک جادو کرنے والا سری لنکا کی ٹیم کی جیت کیلئے اور پاکستان کی ھار کیلئے گراؤنڈ میں وکٹ والی جگہ پر کچھ جادو منتر وغیرہ کر رھا تھا۔ لیکن سری لنکا کی ٹیم پھر بھی ہار گئی۔ ھمارے ملک میں بھی توھمات ہی توھمات۔۔۔ جادو ھو گیا، مجھ پر فلاں نے جادو کروا دیا، اور دوسروں کو نقصان کرنے کیلئے عاملوں وغیرہ کو پیسے دے کر جادو وغیرہ کروانے والوں سے ایک سوال ھے، کہ یہ جادو کے باوجود سری لنکا ھار گیا۔ آخر کیوں؟ جناب آپ سب کیلئے غور کرنے کی بات ھے۔ آپ کو زندگی میں کوئی نقصان ھو جاتا ھے تو آپ کہتے ہی کہ مجھ پر فلاں نے جادو کروا دیا ھے اور دوسروں کو

نقصان دینے کیلئے جادو کروانے والوں کو پیسے دے کر عملیات کروانے والے صاحبو۔
سری لنکا کو جادو بھی ہار سے نہ بچا سکا۔ اسی طرح کوئی اور بھی جادو کے ذریعے آپ کی تقدیر پر قبضہ نہیں کر کے بیٹھ گیا اور نہ ہی آپ کسی کو پیسے دے کر جادو کے ذریعے کسی کی تقدیر بدل سکتے ھیں۔ جناب جادو ھوتا ھے، یہ بات صحیح ھے لیکن آپ نے جادو کا غلط مطلب سمجھ لیا۔ آپ نے تو معاشرے میں بس جادو جادو کا شور مچا دیا ھے۔ آپ کی وجہ سے جھوٹے عاملوں کے کاروبار چل رھے ھیں۔ برائے مہربانی کسی نیک با عمل عالم سے جادو کا مطلب ہی سمجھ لیجئے اور جب کوئی عامل آپ کو یہ کہے کہ فلاں نے آپ پر جادو کروایا ھے یا کسی کے نام کے کچھ حروف بتا دے تو آپ دوسرے مسلمانوں پر بدگمانی کر کے اپنے گناھوں میں اضافہ نہ کیجئے۔ ھم مسلمان ھیں اور بحثیت مسلمان ھم جانتے ھیں، ایمان مفصل بھی پڑھا ھے کہ اچھی اور بری تقدیر اللہ کریم جل جلالہ کی طرف سے ھوتی ھے۔ لہٰذا جھوٹے عاملوں اور ستارہ شناسوں سے جان چھڑوایئے اور جب راھنمائی لینے کی ضرورت پڑے تو صرف ان اچھے لوگوں سے لیجئے جو قرآن و حدیث پر عمل کرنے والے ھیں، قرآن و حدیث کے پابند ھیں کیونکہ اگر کوئی روحانی علم کروایا جائے تو یہ جائز ھے لیکن وھی عمل جائز ھوتا ھے جو قرآن و حدیث کے مطابق ھو۔

اللہ کریم جل جلالہ ھم سب کے حال پر رحم فرمائے۔ آمین۔

سنیں، آپ سے کچھ کہنا ھے

وہ پھول سا چھوٹا سا بچہ تھا، نہ جانے اسے کیسے یہ شعور آ گیا تھا کہ اس کے امی اور ابو جیسے گلے ملتے ھیں اس کی امی کسی اور مرد کو ملے تو گندی بات ھے۔ اس کے شعور نے اسے چپ نہ رھنے دیا، آخر بچہ تھا، اس پھول جیسے بچے نے بڑے بھولپن میں اپنے باپ کے سامنے بات کھول دی۔ ماں نے اسے جھوٹا قرار دیا اور باپ کے جانے کے بعد بیٹے کی خوب پٹائی کی ۔ لیکن اس دفعہ جیسے ھی اس کا عاشق گھر میں داخل ھوا، دیوار پھاند کر خاوند بھی گھر میں داخل ھو گیا۔ بات پھیل گئی۔ دب بھی گئی۔ لیکن صرف کچھ دنوں میں ماں نے بچے کا گلا گھونٹ کر اپنے ھی بیٹے کو موت دے کر اس کے سچ کی سزا دے دی۔ یہ ایک صدمہ ھے۔ دوسرا صدمہ یہ ھے کہ ایک بچی کو جو ابھی ماں کے پیٹ ھی میں تھی اپنے باپ کی لاتیں اور گھونسے سہنے پڑے،اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ لڑکا نہیں تھی، مقدمہ بھی درج ھوا لیکن باپ کی ضمانت ھو گئی اور تاحال مقدمے کی کاروائی جاری ھے۔ تیسرا صدمہ یہ ھے کہ ایک اور ماں نے اپنی لڑکی کی پیدائش پر لڑکا نہ ھونے پر اپنی ظالمانہ فطرت کا اظہار یوں کیا کہ سردی کے موسم میں لڑکا نہ ھونے کے جاہلانہ غم میں بچی کو کپڑے پہنانا ھی ضروری نہ سمجھا اور نہ دودھ پلایا۔ بھوک اور سردی سے بلکتی بچی کے شور سے بچنے کیلئے تھوڑا سا دودھ پلایا، لیکن سنگ دل ماں نے کپڑے پھر

بھی نہ پہنائے۔ بچی چل بسی اور ارد گرد کے لوگ کسی کے ذاتی مسئلے میں مداخلت نہ کرنے کی روایت کو برقرار رکھے تماشا دیکھتے رہ گئے۔ ماں یا باپ کوئی بھی کبھی بھی انسانیت کے مقام سے گر سکتا ھے۔ یہ چند مثالیں ھیں لیکن اسطرح کے کئی صدمے مجھے تنگ کرتے ھی رھتے ھیں اور اب میں ان کا عادی ھو چکا ھوں۔

صرف چند دن پہلے سات سال کا چھوٹا بچہ بھول نہیں پا رھا، جو اپنے آپ کو اور اپنی ماں کو اپنے باپ کی مار سے بچانے کیلئے دعا کرواتا پھر رھا تھا۔ میں نے اسے کچھ پیسے دے کر اس کو بہلانا چاھا لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا اور دعا پر اصرار کیا۔ حالات چھوٹے سے بچے کو بھی وقت سے پہلے بڑا کر دیتے ھیں، سنا تھا دیکھ بھی لیا۔ ان چھوٹے سے نابالغ بچوں کا، ان کے ماں باپ کا اور سب کا ایک ھی مالک ھے، ھمارا رب جل جلالہ اور نابالغ بچوں کو ان کے مالک جل جلالہ کی طرف سے چھوٹ ھے، کوئی گناہ بھی کر لیں تو نابالغ بچوں کا گناہ لکھا ھی نہیں جاتا اور اگر یہ مر جائیں تو سیدھا جنت میں اور جو پیدا ھوتے ھی مر جاتے ھیں، وہ بچے تو اپنے والدین کو جنت میں لے کر جائیں گے۔

لیکن جن کو یہ بچے امانتاً دئے گئے ھیں وہ لوگ، جی ھاں، جنھوں نے پاکستان بنایا تھا ان کے اور ھمارے درمیان کے لوگ جانے کیا سمجھ بیٹھے ھیں۔ پاکستان

بنانے والوں نے ۵۰ لاکھ جانوں کی قربانی دے کر، ڈھائی لاکھ نوجوان مسلم لڑکیوں کے اغوا کا ھولناک غم برداشت کرکے اسی نسل کو ایک نظریے کے تحت پاکستان بنا کر دیا تھا اور ان لوگوں کو پاکستان صرف سنبھالنا تھا۔ جو ورثہ انھیں ملا تھا، اس ورثے کی حفاظت کرنی تھی، لیکن ان لوگوں نے نظریہ پاکستان کو کتابوں میں بند کرکے پاکستان کے دو ٹکڑے کر دئے۔ یہ ملک لٹتا رھا لیکن یہ چین سے گھر میں سوتے رھے اور معاشرے میں انڈین فلموں کی تبلیغ میں مصروف رھے۔ ھم سے کم وسائل والی اور پاکستان کی مثالیں دینے والے پسماندہ قومیں ھم سے بہت آگے چلی گئیں لیکن یہ نسل پاکستان کے ھر مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کر کرکے سب کچھ برباد کرتی رھی۔ اس نسل سے بات کرو تو یہ انگریزوں کے گن گاتی ھے۔ پورے ملک کو غیر ملکی فلموں، فحاشی اور عریانی کے سیلاب میں ان ھی لوگوں نے مبتلا کیا ھے۔ انھیں لوگوں کی لاپروائیوں کے سبب آج ملک پاکستان شدید خطرات سے دوچار ھے۔ یہ وہ لوگ ھیں جو ملک دشمنوں کی ھر سازش کے سامنے جھک گئے، برائی کے ھر سیلاب میں بہہ کر اپنی عیاشیوں میں مگن رھے۔ لیکن پھول جیسے بچوں کیلئے ایک جلاد کا کردار ادا کرتے ھیں۔ آج ھماری نئی نسل کو اپنا سفر وھاں سے شروع کرنا ھے جہاں جناح صاحب اور ان کے رفقاء چھوڑ کر گئے تھے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ھے کہ پاکستان بچانے کیلئے، جناح صاحب کے دئے گئے انقلاب کو برپا رکھنے کیلئے ھمیں اپنے بچوں کی تربیت پر پوری توجہ دینی ھو گی، یہ کل کا پاکستان ھے۔ ھمیں اس درمیانی نسل

کے ان لوگوں کی اس ظالمانہ روش سے جان چھڑانی ہو گی۔ خوف، سہم میں مبتلا مار کھاتے بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو ان کی تمام صلاحیتیں اپنے آپ کو سنبھالنے ہی میں صرف ہو جاتی ہیں۔ یہ ملک کی خدمت کرنے کی بجائے اپنی بھی کوئی خدمت نہیں کر پاتے۔ یہ ایک پہلو ہے لیکن نہایت ہی توجہ طلب۔ اب ہمیں کسی انقلاب کا انتظار کرنے کی بجائے سارے کام خود ہی کرنے ہیں۔ آیئے ہم سارے اس عہد کی تجدید کریں، کہ اللہ کریم جل جلالہ کی رضا کیلئے پیارے محبوب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بچوں سے پیار اور بچوں پر شفقت کی سنت پر تمام زندگی عمل کریں گے، ان کے حقوق پر اپنی اپنی بساط کے مطابق پہرا دیں گے۔ کہیں بھی ان سے حق تلفی ہو گی تو ہر ممکن طریقے سے اس حق تلفی کو روک دیں گے تا کہ پھر کسی بچی کو کسی ظالم ماں کے ظلم کا شکار ہو کر سردی کے موسم میں بھوکا پیاسا بغیر کپڑوں کے مرنا نہ پڑے اور اس دنیا کو اپنی برکتوں سے محروم نہ کرنا پڑے، (بچی رحمت ہوتی ہے) پھر کسی بچی کو ماں کے پیٹ کے اندر ہی اپنے لڑکا نہ ہونے کا جرمانہ نہ ادا کرنا پڑے، کسی بچے کو اپنی ماں کے ہاتھوں گلا گھٹ کر مرنا نہ پڑے، کسی سات سال کے بچے کو اپنے ظالم باپ کی مار سے بچنے کیلئے دعاؤں کی بھیک نہ مانگنی پڑے، ان نابالغ بچوں کو ان کے پیدا کرنے والے رب جل جلالہ کی طرف سے چھوٹ ہے، ہمارے گناہ لکھے جاتے ہیں لیکن ان نابالغ بچوں کے تو گناہ بھی نہیں لکھے جاتے، لیکن ہمارے معاشرے کے جلاد صفت افراد ان کی چھوٹی سی غلطی کے عوض بھی ان پر اپنا قہر برسا دیتے ہیں۔ آیئے

ان بچوں کو ان کے اور سب کے مالک پیارے اللہ تعالیٰ جل جلالہ سے حاصل رعایت اور آزادی کو مل جل کر اپنے معاشرے میں نافذ کر دیں اور نابالغ بچوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کو ہر ممکن طریقے سے روک دیں۔

سڑک پر گاڑی کو غلط لائن پر چلا کر دیکھیں۔ جہاز کو ھوا میں کسی فضائی قانون سے آزاد اڑائیں، قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ حادثہ ھی ھوگا۔ دفتر کے اوقات میں سو جائیں سونے کے اوقات میں دفتر پہنچ جائیں، نقصان ھی ھوگا۔ سب اس بات کو سمجھتے ھیں۔ ھر شعبے کے قوانین کی پابندی کرتے ھیں۔ لیکن فطرت کے قوانین تمام دوسرے قانونوں سے اٹل ھیں۔ دنیا میں بھی وھی صرف وھی قانون انسانیت کیلئے فائدے مند ھیں جو قانون فطرت کے ھم آھنگ یا کم از کم بہت مماثلت رکھتے ھوں۔ فطرت کے قوانین سے ٹکرانا اور مقابلہ ممکن ھی نہیں، لیکن آج کا مسلمان فطری قوانین سے ٹکرا کر اپنے ماضی کی عظمت کی طرف پیٹھ کئے کھڑا ھے۔ مسلمان کی تخصیص اسلئے کہ اسلام کا ماننے والا مسلمان ھے اور اسلام دین فطرت ھے۔ اسلام نے اُسی بات کا حکم دیا ھے جسس میں انسانوں کی بھلائی ھے۔ یہی وجہ تھی جنھوں نے اسلام کو اپنی زندگیوں میں نافذ کیا،اس کائنات کے اسرار ان پر کھلتے چلے گئے۔ ماضی کی عظمت اور تمام علوم و فنون پر مسلم دسترس ایک ایسی حقیقت ھے کہ اپنے کچھ لوگ بھی مغرب کے نشے میں ڈوب کراس کو ایک ڈائیلاگ سمجھنے لگے ھیں۔ لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ھے اور اس حقیقت کو جاننے والے اس کو اظہار کرتے رھتے ھیں۔ مثال کے طور پر مشہورامریکی یہودی فلم میکر جیکوب بائینڈر کا 1 نومبر 2010 کو

وائس آف امریکہ پر آنے والا بیان ھی لے لیں۔ جیکوب بائینڈر کا کہنا تھا کہ مغرب کے عوام اپنی ترقی کا سبب اپنے آپ کو ٹھراتے ھیں، جبکہ انھیں اپنے سے قبل کے اسلامی محققین کا شکر گزار ھونا چاھئے۔ مغرب کے سائنسی انقلاب کی بنیاد اصل میں مسمانوں نے ڈالی تھی۔ ایسی باتیں کرنے والے بہت دانشور ھیں۔ لیکن آج کا مسلمان کیا کر رھا ھے۔ یہ اسے خود سوچنا ھے۔

مسلمان وہ واحد قوم ھیں جن کے پاس فطرت کے قوانین سے فائدہ اٹھانے کا ایک مکمل نظام موجود ھے۔ اس نظام کا نام اسلام ھے اور اسے سے مکمل مستفید ھونے کیلئے ایمان ضروری ھے جس کی امین صرف مسلم قوم ھی ھے۔

اسلام قانون فطرت ھے اور اور اس کا نظام قرآن کریم ھے اور قرآن پاک کی تشریح حدیث ھے اور اس تشریح کو سمجھنے کیلئے سورہ فاتحہ کی آیت صراط الذین انعمت علیھم پر عمل کرنا ھوگا یعنی انعام یافتہ لوگوں کے طریقے پر چل کر اس تشریح کو اپنانا ھوگا اپنی عام زندگی میں، تب ھی مسلمانوں کی اپنی زندگیوں میں اور پوری دنیا پر اسلام کے فیوض و برکات ظاھر ھو سکیں گے۔ ماضی میں مسلم قوم نے جو اسلامی فیوض و برکات حاصل کئے، آج کے جدید علوم فنون اسی کی مرھون منت ھیں۔ ایسے نہیں کہ کچھ مطلب ھوا تو اسلام کے پاس آ گئے، باقی ساری زندگی میں اسلام سے پرھیز۔ انسانی زندگی جہاں جہاں جس بھی درجے

پر اسلامی قوانین سے ٹکراتی ھے، اسلام کی حقانیت نکھر کر سامنے آ جاتی ھے۔ آج سب پیسے کے پیچھے مانگ رھے ھیں، پیسے سے متعلقہ آج تک سارے نظام، موجودہ سودی نظام ناکام ھو چکے ھیں۔ عالمی سطح پر دیوالیوں کا سیلاب سب نے دیکھ لیا۔ ترقی یافتہ کہلانے والے ملکوں کی عوام کا بڑھتا اضطراب اور ان کے بڑھتے مسائل ان کے ملکوں میں رائج نظاموں کی ناکامی کا اعلان کر رھے ھیں۔ صرف اسلامی نظام ھی ھے جس میں امیر کے ساتھ غریب بھی سکون سے سوتا ھے۔ اپنا موضوع عام مسلمانوں کی عام زندگی میں اسلام سے ٹکراؤ ھے۔ ایک بچے کی مثال سے شروع کرتے ھیں۔ دو سال تک ماں کا دودھ بچے کا حق ھے، اسلامی قانون ھے۔ کیونکہ ماں کے دودھ کے علاوہ کوئی دوسری چیز بچے کو مطلوبہ طاقت نہیں دے سکتی۔ آج کے بچے اکثر ماں کے دودھ سے محروم ڈبے کے دودھ پر پلتے ھیں۔ ماں کا کوئی دوسری بیماری ھو تو اس کے علاج پر ھزاروں روپے لگا دیتے ھیں لیکن دودھ کی کمی ھو، (جو کہ اکثر بہانہ بھی ھوتی ھے) تو علاج کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور نتیجتہً بچہ کی صحت پر منفی اثرات جو ھوتے ھیں سو ھوتے ھیں، عمر بڑھنے کا ساتھ ھی ماں پر بریسٹ کی بیماریاں حملہ کر دیتی ھیں۔ وضو اور نماز کو چھوڑنے والے بے شمار جسمانی، ذھنی، جنسی، روحانی فوائد سے محروم رھتے ھیں۔ بیٹھ کر کھانا پینا اسلامی قانون ھے، اس کی خلاف ورزی کرنے پر جو بیماریاں

انسان پر حملہ آور ھوتی ھیں، میڈیکل سائنسیں ان کی تصدیق کر رھی ھے۔ کھانے پینے میں صفائی کے اسلامی معیار کو چھوڑنے کے نتائج خصوص طور پر بازاری ھوٹلوں میں مشاھدہ کئے جا سکتے ھیں۔

اسلامی تاکید ھے آٹا ان چھنا کھایا جائے۔ ایک معمولی سی بات۔ عمل نہ کرنے سے قبض کا دروازہ کھل جاتا ھے جو سب بیماریوں کی ماں ھے۔ داڑھی ایک مٹھی رکھنا سنت ھے۔ لیکن رکھتے ھی نہیں اور اگر رکھیں بھی تو ایک مٹھی سے کم یا زیادہ۔ داڑھی رکھنے کے جسمانی اور جنسی صحت پر مثبت اثرات کی رپورٹس آئے بہت دیر ھو چکی۔ بھوک لگے تو کھائیں اور بھوک رھتی ھو تو چھوڑ دیں، یہ بیماریوں سے حفاظت کا قیمتی نسخہ ھم نے چھوڑ دیا اور آج طبّی محققین بہت ساری بیماریوں کی جڑ اسی بات کو قرار دیتے ھیں۔

فرد سے فرد کے تعلقات میں اسلامی ھدایات کا علم نہ رکھنے کا خمیازہ، ساس بہو، والدین اور اولاد، خاوند بیوی، اپنے کاروبار میں، دفتری ملازمین کی آپس میں ناچاقیوں میں ھم بھگت رھے ھیں۔ پیسہ کمانا چاھتے ھیں، اسلامی قوانین کو پس پشت ڈال کر محنت کرتے ھیں بے برکتی عام ھے۔ سارا دن محنت کرتے ھیں جس (جل جلالہ) نے رزق دینا ھے اس (جل جلالہ) پر توکل کی دولت سے خود کو محروم کر رکھا ھے۔ بھول گئے ھمیں ایک مسلمان کو روزی تلاش کرنے کی سنت ادا کرنا ھوتی ھے اور فرائض، واجبات کے اھتمام کے ساتھ ، لیکن رزق اللہ کریم جل جلالہ کی مرضی ھی سے

ملتا ھے۔ توکل، بھروسہ ،امید یقین اللہ کریم (جل جلالہ)پر رکھنی ھوتی ھے۔ لیکن آج اکثریت کی نظر اور خیال کا حال ایسا نہیں ھے۔ ایک مسلمان کی سیاسی ذمہ داری کیسی ھونی چاھئے، نہ جاننے کا نتیجہ سارا ملک بھگت رھا ھے ،بڑی بڑی ڈگریوں کیلئے لاکھوں روپے خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کو بھی سیکھ لیا جاتا تو اچھا بلکہ سب اچھا ھو جاتا لیکن ھم ایسا نہیں کرتے۔

آج کا مسلمان چاھتا ھے، کہ وہ انڈین فلمیں دیکھے، مغربی لباس پہن کر معزز بنے اور اور اپنے سارے کنبے کے ساتھ مغربی طرز زندگی میں اعلیٰ مہارت حاصل کرے اور جب بیمار ھو، دوائیاں کھا کر اگر آرام نہ آئے تو] پھر اللہ کریم جل جلالہ کی یاد آتی ھے۔ گویا جبتک مصیبت نہیں آئے گی ھم اللہ کریم جل جلالہ کو یاد نہیں کریں گے۔ نیتجہ کیا ھے پریشانی، ذلالت صرف اس زندگی میں نہیں اگلی زندگی میں بھی۔ لیکن جنھوں نے اسلام کو سمجھا ھے، اپنی عام زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کی ھے وہ ھر جگہ کامیاب ھی کامیاب ھیں۔ کئی سو سالہ تاریخ اس بات کی گواہ ھے اور ھمارے آج کے دور میں بھی، اگر ھم دیکھنا اور سمجھنا چاھیں۔ اگر ھم اپنی عام زندگی میں، اپنی معاشرتی زندگی میں، اپنی سیاسی ذمہ داریوں میں ، اس زندگی کے بعد میں آنے والی زندگی میں کامیاب ھونا چاھتے ھیں تو گھر میں، دفتر میں اور اس معاشرے میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مسلم امت کی کامیابی کیلئے سب کو اپنی ذات پر اسلام نافذ

کرنا ھوگا اور کسی کہ یہ بات نہیں مانتی تو عرض ھے مان جائو ورنہ۔۔۔۔ خسارہ ھی
خسارہ ھے۔

نماز اپنی پڑھنی ھے

اوہ یار ھم نے نماز اپنی پڑھنی ھے، ھمیں امام سے کیا لگے۔ یہ ایک مسئلہ ھے جو اکثر جگہوں پر اس وقت ھو جاتا ھے، جب ایک بندہ کہتا ھے کہ میں نے فلاں امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی اور دوسرا اصرار کرتا ھے کہ یار ھم نے اپنی نماز پڑھنی ھے ھمیں اس سے کیا۔ ھمیں اس سے کیا کہنے والے بعض دفعہ اس بات کی آڑ ضرور لیتے ھیں کہ یہ فرقے بازی ھے۔ اپنی کم علمی اور جہالت کو چھپانے کیلئے فرقے بازی کا لفظ بول کر اس کی آڑ لے لی جاتی ھے اور " ھمیں اس سے کیا"، یہ بات، یہ سوچ ایک المیہ ھے جو نماز کو ایک عام سی چیز سمجھنے ، بلکہ دین کو بے وقعت سمجھنے کی وجہ سے ھم پر مسلط ھے۔ ھم نے اپنی نماز پڑھنی ھے، یہ بات کرنے والے جب ضرورت کی کوئی بھی چیز مثلاً، واشنگ مشین، ٹی وی وغیرہ یا کچھ اور لینے جب مارکیٹ جاتے ھیں تو ساری مارکیٹ پھرتے ھیں، دوکانداروں سے بحث کرتے ھیں، ایک کپڑے کو دس بار مختلف زاویوں سے دیکھتے ھیں، اپنے بچے کو سکول میں داخل کروانے سے پہلے سو دفعہ تسلی کرتے ھیں، کہ سکول کیسا ھے، تعلیم اچھی ھے یا نہیں صرف اسلئے کہ یہ ھر چیز میں اچھا معیار چاھتے ھیں۔ بچے بچی کی شادی کرنی ھو تو دن رات سوچیں گے، اس لئے کہ ان چیزوں کی اھمیت ان کے نزدیک بہت زیادہ ھے۔ یہ کوئی ایسے عام سے کام نہیں جو آنکھیں بند کرکے کر لیں۔ لیکن

نماز، ان سب چیزوں سے زیادہ اھمیت رکھنے والی نماز، بحثیت مسلمان ھمارافرض نماز، یہ لوگ اس نماز کو ان چیزوں جتنی اھمیت بھی دینے کو تیار ھی نہیں۔ ادا ھی نہیں کرتے، اور اگر ادا کرتے ھیں تو اتنی لاپرواھی سے اور اتنا غیر ضروری سمجھ کر، کہ نماز پڑھانے والا چاھے نماز کا اھل نہ ھی ھو، اس کے پیچھے ادا کر کے چلتے بنتے ھیں۔ دوسری چیزوں میں ان لوگوں کا ایک معیار ھے لیکن نماز ایک بوجھ جیسی ھے، جس کو بس سر سے اتارنا ھے، چاھے جیسے بھی۔ رشتے اچھے نہ ھوں تو رشتے نہیں کئے جاتے، کمپنی ٹھیک نہ ھو تو یہ لوگ چیز نہیں خریدتے، اپنی تسلی کر کے خریدتے ھیں تو پھر امام اگر بد کردار ھو، اس کو قران پاک ھی ٹھیک نہ پڑھنا آتا ھو، اسلام کے نام پر اپنی جہالت کی دوکان کھول کر بیٹھا ھو، اس کی حرکتیں کم از کم اتنی اسلامی بھی نہ ھوں کہ اسے شریف آدمی کہا جاسکے، اور شرعاً وہ امام بننے کے قابل نہ ھو تو پھر چاھے وہ داڑھی والا ھو، اس کی عمر جتنی مرضی ھو، اس کا نام ظاھری طور پر جتنا مرضی بڑا ھو اس کے پیچھے نماز نہیں ھوتی، اس کو اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی پاک بارگاہ میں نماز پیش کرتے وقت امام نہیں بنایا جاسکتا، اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے بہتر ھے کہ اکیلے ھی نماز پڑھ لی جائے، نماز کی اھمیت کوئی رشتوں جیسی نہیں، نماز کی اھمیت کوئی اچھی کمپنی کے اچھے ماڈل کی واشنگ مشین جیسی بھی نہیں اور نماز کی اھمیت بچوں کے بہت اچھی ساکھ والے سکول جتنی نہیں بلکہ ان سب سے بڑھ کر ھے بلکہ ان تمام کاموں کا تو نماز کے ساتھ

کوئی موازنہ ھی نہیں کیا جا سکتا۔ نماز کی اھمیت ان سب سے بہت زیادہ ھے اس لئے نماز کیلئے وضو بڑے دھیان سے کیا جائے گا، نماز کیلئے جگہ کا انتخاب احتیاط سے ھو گا کہ صاف ھو، اور نماز کیلئے امام کا انتخاب شریعت کے تقاضوں کے مطابق ھو گا۔ امام کم از کم مناسب کردار اور دین سے بنیادی وابستگی والا تو ھو۔ اگر اس میں کوئی اعتراض والی بات ھو گی تو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ اگر کوئی قابل اعتراض باتوں کی وجہ سے کسی امام کی پیچھے نماز نہ پڑھنے پر فرقے بازی کا نعرہ لگائے گا تو ایسے جاھل پر بس افسوس ھی کیا جا سکتا ھے اور مناسب ھو تو ایسوں کی اصلاح کی کوشش بھی کرنی چاھئے اور اسے بتانا چاھئے کہ امامت اور فرقے بازی دو علیحدہ موضوع ھیں۔

یہ بھی انسان ھیں

ماضی قریب کے گزرے سالوں میں پاکستان کے مسائل میں خطرناک اضافہ ھوا ھے اور ان کے حوالے سے باتیں بھی ھوتی رھی ھیں۔ ان گزرے سالوں سے پہلے اور ان کے دوران گورنمنٹ ،ملازمین کی تنخواھوں میں کافی دفعہ اضافہ کیا گیا ھے اور ان کو کسی نہ کسی صورت میں سہولیات بھی حاصل ھیں، جیسے میڈیکل الاؤنس، میڈیکل کی چھٹی، کام کے مناسب اوقات، اتوار کی چھٹی، بغیر دباؤ کے کام کرنے کا ماحول، کچھ کو گھر یا گھر کے کرائے کی سہولت، ملازمین کی یونین کی سہولت۔ آج تک کی پاکستان میں گزاری زندگی کا چشم دید مشاھدہ ھے کہ سرکاری دفاتر میں اگر کوئی کام چوری، رشوت خوری، بے ایمانی، جھوٹے میڈیکل بنوا کر چھٹی کرنا چاھے تو ان برائیوں پر عمل کرنے کا عجیب سازگار ماحول میسر ھے، جو کہ ایک مفت کی بری سہولت ھے اور اس کی وجہ بدانتظامی ھے۔

لیکن پاکستان کے کل ملازمین کا تقریباً ۸۰ فیصد طبقہ پرائیویٹ ملازمین نام کی مخلوق ھے، جن کے ۷۳ فیصد طبقے کے مسائل انتہائی خطرناک ھو چکے ھیں۔ ان میں مجبور سسکتے بلکتے جوان، بوڑھے مردوں کے ساتھ، انتہائی مجبور خواتین کے ساتھ، نابالغ بچے بھی شامل ھیں۔ ان کی تنخواھیں کم نہیں انتہائی کم ھیں، عام

طور پر چھٹی کی کوئی سہولت نہیں ھے۔ایک آدھی چھٹی کرنے پر بھی خاصا دباؤ ھوتا ھے۔ زیادہ تر ملازمین کے کام کے اوقات دس سے بارہ گھنٹے تک ھیں، کوئی مسلہ ھو تو کسی قائدے قانون کے بغیر چند منٹوں میں نوکری سے برخاست کر دیا جاتا ھے۔ اکثر اداروں میں پرائیویٹ ملازمین کی ملازمت میں سر جھکا کر گالیاں سننا اور کبھی مار پیٹ کا نشانہ بننا بھی شامل ھے۔ امیروں کے گھر بھی غریب لوگوں کے اداروں جیسے ھی ھیں اور ٹی وی چینلز پر ملازمین کی تشدد سے اموات ، ذمہ داروں پر مقدمات کی خبریں بھی چلتی رھتی ھیں، لیکن آج تک کبھی ان کو سزا کی خبر نہیں سنی۔ ان بیچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں۔ تقریباً ۸۰ فیصد پرائیویٹ ملازمین کے کم و بیش ۷۵ فیصد ملازمین کو علاج معالجے کی مناسب سہولتیں نہیں ھیں۔ پرائیویٹ ملازمین کی حق تلفی کرکے ان کے ذھنوں سے یہ احساس ختم کیا جارھا ھے کہ وہ بھی اس ملک کے باعزت شہری ھیں۔ عملی طور پر ان کیلئے کوئی ادارہ بھی کام نہیں کر رھا۔ کچھ برائے نام محکمے پرائیویٹ ملازمین کے نام پر کاغزات میں سب اچھا دکھانے اور رشوت لینے کا کام کرتے نظر آتے ھیں۔ چند سوشل سیکورٹی ھسپتال ھیں لیکن ان میں علاج کرانے کا حق یا اجازت کم و بیش ۲ یا ۳ فیصد پرائیویٹ ملازمین کو حاصل ھے۔ پرائیویٹ ملازمین کے آنسو ارباب اختیار کی آنکھوں سے ھمیشہ اوجھل رھتے ھیں۔ کسی انسان کی ناحق جان لے لی جائے تو خوف اور سہم کی ایسی فضا بنتی ھیں جسے ھم دہشت گردی کہتے ھیں اور جو کچھ پاکستان میں پرائیویٹ ملازمین کی اکثریت کے ساتھ ھو

رہا ھے وہ کس درجے کی دھشتگردی ھے اس کا تعین اب میڈیا کے افراد کی توجہ کا متقاضی ھے۔ پرائیویٹ ملازمین کے استحصال کے وہ واقعات جن کا مشاھدہ میں نے خود کیا ھے، جب بھی یاد آتے ھیں، مجھے انتہائی ذھنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ھے، سمجھ نہیں آتا کہ جن کے ساتھ بیتی ھے ان کا کیا حال ھوگا۔ پرائیویٹ ملازمین کی اکثریت کا حال ایسا ھے جیسے زندہ انسانوں کے روپ میں چلتے پھرتے مردے، ان چلتے پھرتے مردوں کی زندگی بحال کرنے کیلئے فوری اقدامت کی ضرورت ھے، قانون کو حرکت میں لانے کی ضرورت ھے۔ اگر انسانوں کے ان سکتے بلکتے گروہ کیلئے کوئی مضبوط سسٹم حرکت میں آ گیا تو ٹھیک، ورنہ سیاست سیاست کھیلنے والے یہ جان لیں کہ ان مجبور بے آواز لوگوں کی آھوں، بدعائوں سے وہ کسی صورت نہیں بچ سکیں گے۔

نیا کاروبار کریں

ھمارے مصیبت زدہ معاشرے کا عوامی طبقہ اسوقت جن مصیبتوں کا شکار ھے، یہ سب کے علم میں ھے، لیکن مڈل کلاس لوگ جن مشکلات کا شکار ھیں اس کا ادراک ان کے علاوہ کسی دوسرے کیلئے ناممکن جیسا ھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ھے کہ اس طبقے کو ھر حال میں اپنی سفید پوشی کو قائم رکھنا ھوتا ھے اور اپنی سفید پوشی کے چکر میں یہ اپنی مصیبتوں کا رونا بھی نہیں رو پاتے۔ شاید میڈیا ان کے مسائل کی نشاندھی کر سکتا لیکن افسوس کے ھمارا میڈیا کا زیادہ وقت سیاستدانوں کیلئے وقف ھے۔

معاشرے کے تمام افراد کو رھنے سونے کیلئے گھر کی ضرورت ھوتی ھے اور ظاھر ھے کہ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے گورنمنٹ ملازمین اور پرائیویٹ ملازمین کو بھی رھنے کیلئے گھر کی ضرورت ھوتی ھے۔ لیکن حالات کا عالم یہ ھو چکا ھے کہ گھر مڈل کلاس پرائیویٹ ملازمین کی پہنچ سے باھر نکلتے جا رھے ھیں اور یہ ان کیلئے ایک نئی مصیبت ھے۔ مڈل کلاس پرائیویٹ ملازمین کا خصوصی ذکر اسلئے کہ ان کی ظالمانہ اور جبری کم تنخواہوں اور مہنگائی میں فرق بہت زیادہ بڑھ چکا ھے۔ گھروں کے کرایوں اور بجلی، گیس کے بلوں نے ان کی بے چینی کو ایک مستقل عذاب میں بدل دیا ھے۔

گھروں کے کرایے زیادہ ھیں، پلاٹ لینا اس کم تنخواہ دار طبقے کیلئے بہت مشکل ھے۔ اول تو پلاٹ لے نہیں سکتے اور اگر لے لیں تو بنا نہیں سکتے۔ اس بات کی اشد ضرورت ھے کہ چھوٹے، سادہ گھر بنا کر مڈل کلاس پرائیویٹ ملازمین کی تنخواھوں کو مد نظر رکھتے ھوئے ان کی آسانی کی اقساط پر ان کو دیئے جائیں۔ گورنمنٹ کو کچھ گھر بنا کر عوام کو مفت دینے چاھئیں۔ سرمایہ کاروں کو اس طرف راغب کرنا چاھئے۔ سرمایہ دار خود بھی ایک اچھی نیت کے ساتھ یہ کاروبار شروع کر سکتے ھیں۔ گھروں میں رھنے والے گھر چھوڑ کر یا گھر کو اٹھا کر کہیں نہیں لے جا سکتے۔ منافع یقینی ھے۔ ھماری حکومت سرمایہ کاروں کو عوام کیلئے مفت یا سستی زمین بھی دے سکتی ھے، لیکن عوامی شرائط کے ساتھ حکومت کی کڑی نگرانی کی ضرورت ھر حال میں رھے گی۔

ملکی خوشحالی کیلئے مڈل کلاس پرائیویٹ ملازمین کی بے چینی کو ختم کرنا انتہائی ضروری ھے اور یہ وقت کی آواز ھے۔ گھروں کی تعمیر کی بات ھو تو ایک نام ملک ریاض بحریہ ٹائون کا ھے جو بلاشبہ اس شعبے کا ایک بڑا نام ھے۔ اگر ملک ریاض ھی اس بارے میں کچھ سوچیں اور کر گزریں تو یہ کاروبار کے ساتھ ،ایک عظیم نیکی ھو گی اور مڈل کلاس پرائیویٹ ملازمین ان کے دنیا سے جانے کے بعد بھی ھاتھ اٹھا کر ان کیلئے دعائیں کرتے رھیں گے اور اس سودے میں ھر لحاظ سے

فائدہ ھی فائدہ ھے۔

پلیز روک دیجئے

لوگ کہتے ھیں جب وہ چھوٹا سا تھا، بہت پیارہ بچہ تھا، تمیز والا بھی تھا۔ ذرا بڑا ھوا تو پڑھائی میں بھی نمایاں تھا۔ جہاں جاتا سب کا پیارا بن جاتا۔ لیکن جوں جوں وہ بڑا ھوا، اس کی عقل، اس کی سوچوں پر ایک خوف غالب ھوتا گیا وہ خوف تھا اس کے باپ کے جنگلی پن کا۔ بچہ پہلا تھا اور بہت ذھین، سو اس کی حساسیت نے اس خوف کو ایسے محسوس کیا کہ اس کی شخصیت تباہ ھوتی چلی گئی۔ جب وہ بلا وجہ اپنی ماں کو مار پڑتے دیکھتا، خود بھی کھاتا تو وہ سہم سہم کر سہم ھی گیا، اسی طرح بڑا ھو گیا۔ ماں کی چیخیں، ماں کے منہ سے نکلتے خون، نازک جسم پر باپ کے تھپڑ، ٹھڈوں نے اس حساس ترین بچے کو ایک سہمی مخلوق بنا دیا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے گھر سے باھر کی دنیا کو محسوس کرنا شروع کیا تو اسے پتہ چلا کہ باپ کے وحشی پن کے علاوہ بھی دنیا میں کچھ ھے۔ حساس بچے ذھین ھوتے ھیں لیکن کوئی راھنما چاھئے۔ ماموں خالہ نانا نانی تو تھے نہیں، باپ کی طرف سے دادا دادی چچا پھوپھو تو پہلے بھی تھے اب بھی تھے، لیکن اتنی بڑی دنیا میں کوئی دلجوئی، کوئی راھنمائی نہ ھو سکی۔ بچہ اپنی ماں سے بھی ذھنی طور پر بچھڑ گیا، ذھن ھی مائوف تھا۔ کالج گیا، لیکن حساس، سہما، تنہا، پیار کے احساس سے خالی ذھن لئے پڑھ نہ سکا، پڑھائی کیلئے اس کے پاس ایک نارمل ذھن ھی نہیں

تھا۔ زندگی کا سفر طے ھوتا گیا۔ سہم اور خوف میں پلا، ڈپریشن کا مریض باپ کے ظلم اور جنگلی پن سے آزاد ھوا تو اس کی عقل نے کام شروع کر دیا۔ اسے اپنے سہم، خوف، وجود کے اندر کی تنہائی، اپنی ناکامیاں اور ان کی وجوہات سمجھ آنے لگیں۔ خود سے اپنے آپ کو سمجھا کر اپنا علاج کرنے لگا۔ سہم، بداعتمادی، خوف کھرچ کھرچ کر اپنے دماغ سے صاف کر دیا۔ پھر اس کی نظر سے کوئی ایسا بچہ، شخص چھپ نہ پایا جس کی شخصیت اس کے باپ کے ظلم نے تباہ کر دی تھی۔ اس نے متاثرہ بچے، شخص کو اپنی عقل سے، اپنے پیار سے ایک نارمل انسان بنا کر ھی دم لیا۔ وہ کہتا ھے کہ جب بھی مجھے کسی نے کہا کہ آپ نے ھماری زندگی بدل دی، ھمیں جینا سکھا دیا اسے عجیب سکون ملتا تھا۔ وہ کئی ظالم باپوں کے بیچارے بچوں کو پڑھنے پر قائل کر کے خوش ھے۔ بے شمار بچوں کو خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال کر کے وہ بہت خوش ھے اور اب اس نے مجھ سے یہ عجیب درخواست کی ھے کہ میں اس کا یہ پیغام لکھ کر نیٹ پر ڈال دوں، کہ بچوں کے ساتھ بچپن میں سختی ان کی شخصیت کو تباہ کر دیتی ھے، بچے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے قابل نہیں رھتے، ان سے پیار کیجئے، انھیں برداشت کیجئے، ان کی تربیت، ان پر سختی پیار سے کیجئے۔ ان پر سختی کر کے ان پر ساری زندگی کیلئے ناکامی کا ٹھپہ نہ لگا دیجئے۔ یہ بچے کل کا پاکستان ھیں۔ ان کو پیار کر کے ایک اچھا پاکستان تخلیق کیجئے۔ سبق یہی ھے کہ آپ کے ارد گرد کوئی ظالم باپ موجود ھے تو اس کے بچوں کی مدد کیجئے، ظالم باپ کو بچے کو پیار اور

بچے پر ضرورتا سختی کرنے کے اسلامی طور طریقے سکھا دیجئے۔ اسے بتایئے کہ کم و بیش چودہ سو چھتیس سال پہلے اسلام نے بچوں پر ظلم کرنے کو انتہائی سنگین گناہ اور ظالم کو سزا اور عذاب کا حقدار قرار دے دیا تھا۔ اس ظالم کو حکمت عملی کے ساتھ اس ظلم سے روک دیجئے۔ یہ بچے پاکستان کا سرمایہ ھیں، اس سرمائے کا تحفظ ھر پاکستانی کا فرض ھے۔ آپ بھی اپنی فرض ادا کیجئے۔ ایک چھوٹی سی بات، ھمارے معاشرے میں میڈیا ھو یا کوئی عوامی محفل، ص مغرب کی ترقی کا بہت چرچا رھتا ھے۔ مغرب کے ترقی یافتی معاشرے کی ایک خوبی یہ بھی ھے کہ وھاں ماں باپ کا بچوں کا مارنا انتہائی سنگین جرم ھے اور اگر بچے کو کوئی مار بیٹھے تو وہاں کا قانون انتہائی سختی سے فوراً حرکت میں آ جاتا ھے اور ظالم ماں باپ کو فوری سزا بھی ملتی ھے۔

عرض بنام اعتراض

اگر کوئی کسی کی غیر موجودگی میں بغیر تحقیق کے کوئی اعتراض کر دے جو اگلے کو برا لگے تو یہ انتہائی نامناسب بات ھے۔ سمجھدار لوگوں کیلئے ایسی باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ھے اور ایک لکھنے والے کیلئے تو بہت ھی ضروری ھے۔ اخلاق دین سے نکلا ھے اور اخلاقیات کا تقاضا یہی ھے کہ کسی کی بات اگر کسی وجہ سے کرنی ضروری ھو، مثلا انسانیت کی فلاح کے حوالے سے تو پوری تحقیق کے بعد کی جائے، محض سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر فیصلہ نہ سنا دیا جائے۔ برائی کی نشاندھی کرکے دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش صحافت کا تقاضا ھے لیکن ظاھر ھے اس میں سچی دلیل بھی ھونی چاھئے۔ مغربی معاشروں میں کچھ اچھی باتیں بھی رائج ھیں اور کچھ ھمیں نامناسب بھی لگتی ھیں لیکن ان کی اچھی یا بری باتوں کو بطور دلیل ھم اپنے معاشرے میں نافذ نہیں کر سکتے۔ اگر کرنا چاھیں تو ھم اپنے نفع نقصان دیکھ کر ھی کریں گے۔ ھومیو پیتھک ایک مسلمہ طریقہ علاج ھے، جس کی ایک پوری تاریخ ھے اور ھومیو پیتھی دوسرے طریقہ علاج کے ساتھ مغربی معاشرے میں بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ھے۔ اس کی بہت تعریف بھی موجود ھے، لوگ اس کو پڑھ کر ان معاشروں میں پریکٹس بھی کر رھے ھیں اور ان کی پریکٹس اسی معاشرے کے مریضوں کے اعتماد کی مرھون منت ھے اور صرف ھومیو پیتھک پر نہیں

دوسرے طریقہ علاج پر بھی تنقید ہوتی رہتی ہے۔ مغربی معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ایلوپیتھک پر شدید تنقید کرتے ہیں لیکن اگر ان کی تنقید کو لے کر ایلوپیتھک طریقہ علاج پر قلمی بوچھاڑ کر دی جائے تو کسی ذمہ دار لکھاری کیلئے یہ ممکن نہیں ہوگا کیونکہ وہ جب لکھے گا تو اسے ایلوپیتھک کا ایمانداری سے مشاہدہ کرنا ہوگا،بنیادی معلومات حاصل کرنی ہوں گی اور ایلوپیتھک سے وابستہ خرابیاں اپنی جگہ لیکن انسانیت کو پہنچنے والے فائدوں کا تقاضا اسے ایلوپیتھک کی خوامخواہ مخالفت سے باز ہی رکھے گا۔ سمجھ نہیں آتا کہ ایک اخبار کے کالم نگار کی ہومیو پیتھک پر انتہائی نامناسب قلمی مشق کا کیا مقصد ہے۔ کالم پڑھ کر تو غیر ذمہ دارانہ رویے اور ایک تہمت کا گمان گزرتا ہے، جس کی وجہ جلدی اور ہومیوپیتھک سے ناواقفیت ہی ہو سکتی ہے۔ ہومیو پیتھک پر اعتماد کرنے والے لوگوں، مریضوں کی تعداد قابل ذکر ہے اور حیران کن بھی لیکن ایلوپیتھک کا ایک اپنا نمایاں اور غالب مقام ہے۔ اگر کالم نگار مغرب کی ایک کمزور سی تنقید کو اپنا معیار بناتے ہیں تو ڈاکٹر جوزف مرکولا، شکاگو،امریکہ کی سائٹ پر سب سے بڑے اور پوری دنیا میں رائج طریقہ علاج کے بارے میں موجود اعتراضات کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ڈاکٹر ہارڈن بن جونز آف کیلیفورنیا کا کیموتھراپی پر اعتراض اس لنک میں دیکھیں۔

http://www.naturalnews.com/048827_chemotherapy_cancer_treatment_patient_survival.html

وہ تو کیموتھراپی کو کینسر کے مریضوں کی موت کی وجہ قرار دے رہے ہیں۔

لاھور میں کینسر کے مریضوں کا علاج کیمو تھراپی سے بھی کیا جاتا ھے، تو کیا آپ کی تقلید میں کیمو تھراپی کو بند کرانے کا ایک غلط مطالبہ کر دیا جائے۔ کیا اس کو بنیاد بنا کر ایلوپیتھک کے بارے میں قلمی حملے شروع کر دئے جائیں۔ جناب تنقیدیں ھوتی ھیں اور غلط بھی ثابت ھوتی رھتی ھیں اور صحیح بھی ھوتی ھوں گی، لیکن اصل بات افادیت کی ھے۔ اگر لوگوں کو فائدہ ھو رھا ھے تو یہ طریقہ علاج کے جاری رھنے کا جواز ھے اور تنقید برائے اصلاح کی ضرورت ھر وقت رھتی ھے اور ترقی اور بہتری میں مثبت تنقید کا بڑا کردار ھوتا ھے، لیکن تنقید کا انداز ایسا نہیں ھونا چاھئے جس سے ناجائز مخالفت اور تعصب کا تاثر پیدا ھو اور وہ قلمی فساد کا باعث بن جائے۔ بہت سارے اچھے ڈاکٹروں کے ساتھ بہت سارے جعلی ڈاکٹر بھی کام کر رھے ھیں۔ مریض خوار ھو رھے ھیں۔ بڑی بیماریوں کا ایلوپیتھک علاج مڈل کلاس کی پہنچ سے باھر ھے۔ مری اپنی والدہ کی نوویڈیٹ گولیوں سے خون کی نالیاں پھٹ گئیں۔ علاج کرنے والے پروفیسر ڈاکٹر تھے۔ بے شمار مریضوں کو میڈیسن کے سائیڈ ایفیکٹس ھو جاتے ھیں۔ کیا اس پر لکھا گیا۔ ھسپتالوں کے حالات مزید بہتر کرنے کی ضرورت ھے اور ھسپتالوں کی ضروت ھے۔ لیکن ابھی کوئی صورت نظر نہیں آ رھی۔ کیا ان پر کوئی کالم لکھا گیا۔ ۲۹ مارچ کو جنگ اخبار میں ڈاکٹر صفدر محمود نے ساہیوال کے ایک صاحب کا ذکر کیا ھے، جنھوں نے اپنے کینسر کے مریض کا جرمنی میں ہومیوپیتھی کے ذریعے کامیاب علاج کروانے کے بعد خود ہو میوپیتھی کے ذریعے مفت علاج کا

کلینک کھولا۔

اپریل کو جنگ اخبار میں عظیم سرور صاحب کے کالم میں بتایا گیا ھے کہ آسٹریلیا اور ۸ برطانیہ دونوں ملکوں کی آئینی سربراہ ملکہ الزبتھ اور ان کا خاندان ہومیوپیتھک علاج کو ترجیح دیتا ہے۔ لندن میں قیام کے دوران عظیم سرور صاحب نے اپنا چشم دید مشاھدہ لکھا ھے کہ بی بی سی کے اسٹوڈیوز میں پروفیسر بلیکی کو دیکھا جو ایک تقریر کرنے آئی تھیں۔ بتایا گیا کہ وہ ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہیں اور ملکہ برطانیہ کی خاص معالج ہیں۔ وہ لکھتے ھیں کہ میں یہ بات جان کر حیرت زدہ سا ہوگیا اور ان کے دوست نے بتایا کہ انگلینڈ میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر اسپیشلسٹ کہلاتے ہیں اور ان کی فیس عام ڈاکٹروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات میں ھومیوپیتھک کا بطور طریقہ علاج کردار قابل ذکر ھے اور مریضوں کی شفایابی کا تناسب دیکھ کر تعریف کے قابل بھی، لیکن بلاشبہ بہت ساری بہتری کی ضروت ھے اس کیلئے کوشش جاری ھے۔ مذکورہ کالم نگاراس بات کو محسوس ھی نہیں کرسکے کہ ھومیوپیتھک سے وابستہ لوگ مختلف وجوہات کی بنیاد پر ھومیوپیتھک سے شدید محبت رکھتے ھیں۔ ایک سینئر جرنلسٹ کو آپ قلم کشائی سے پہلے کچھ تحقیق کر لینا چاھئے، تعصب سے پرھیز کرنا چاھئے اور اصلاحی تنقید کرکے ایک محتسب کا کردار ادا کرنا چاھئے ۔ انڈیا میں دوائیوں کی قیمتیں کم ھیں، پاکستان میں بہت مہنگی۔ پاکستان میں

اشیائے خوردونوش کے حوالے سے میڈیا کے کچھ افراد نشاندھی کرتے رہتے ھیں۔
پنجاب میں پرائس کنٹرول کمیٹی کچھ عرصے سے متحرک نظر آ رھی ھے لیکن میڈیسن کی
کوالٹی، معالجوں کی عوامی پہنچ سے باھر جاتی فیسیں، ھسپتالوں میں لاپرواہی کے
معاملات یہ سب وہ سلگتے مسائل ھیں جن کے بارے میں سنجیدگی سے آواز اٹھانے کی
ضرورت ھے اور کسی بھی طریقہ علاج پر اصلاحی تنقید ھونی چاھئے لیکن غیر ضروری
تنقید کی تو ھرگز کوئی گنجائش نہیں۔

شریف، کمزور آدمی کا احساس کرنے والا، بس اتنا نہیں بلکہ حکمت کی دوائیوں کو سٹیرائیڈز استعمال کئے بغیر بنانے والا، پرانے حکیموں کی طرح مزاج کے مطابق نسخہ ترتیب دینے کے فن کا ماھر اور حکیم ایسا جس کے علاج سے مریضوں کی اکثریت کو شفا نصیب ھو رھی ھو۔ ایسے حکیم ھوں گے لیکن پتہ نہیں کہاں۔ لیکن وہ پرانے حکیموں کی لائن کا بہت اچھا حکیم تھا۔ طب کے ایک کالج کا پرنسپل بھی رھا۔ پریکٹس بڑھ گئی تو حکیم نے اپنا پورا دواخاں۔ بنا لیا دوائیاں تیار کرکے مارکیٹ میں سپلائی بھی شروع کر دی۔ مستحق مریض حکیم کو فون کرتے، حکیم جاتا اپنی دوائیاں بھی سپلائی کرتا اور کسی کو مفت اور کسی کو انتہائی سستی دوائی دے کر چلا جاتا۔ لوگوں کی خدمت کرکے حکیم کو خوشی ھوتی اور شفایاب ھونے والے مریض سے ،ں۔ ضرور میٹھا کرتا۔ کئی مریضوں کا سستا اور مفت علاج ھوتا رھا اور مریض صحت یاب ھوتے رھے۔ لیکن حکیم نے آنا کم کر دیا اور دور نہ جا سکنے والے مریض وھیں کے وھیں رہ گئے۔ وجہ حکیم کی پریشانی تھی اور وجہ ایک معمولی لیکن عجیب سی بات تھی۔ بنا تحقیق کے زبان چلانے والے چلتے پھرتے ریڈیو نما لوگوں نے حکیم کے اچھے مالی حالات سے حسد کا شکار ھو کر مطب سے غیر حاضری پر مشہور کر دیا کہ حکیم کوئی دو نمبر کام کرتا ھے جو مطب بند رکھ کر بھی اتنے

پیسے کما رہا ھے، پلاٹ بھی خرید لیا۔ یہ بات اس شدت اور انداز سے مشہور ھو گئی کہ حکیم کو اپنا سپلائی کا کم روک کر مطب پر زیادہ وقت دینا پڑا۔ بات بڑی معمولی سی تھی لیکن ایک شریف آدمی نے اس کا بڑا اثر لیا۔ اب حکیم کا کام پھر سے عروج پر ھے اور باتیں کرنے والوں کا کچھ پتا نہیں۔ حکیم کا کام تو نہیں رکا لیکن ذھنی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ شریف آدمی کو کوئی دو نمبر کہ دے تو اسے مصیبت پڑ جاتی ھے۔ ذھنی پریشانی کی وجہ صرف بہتان بازوں کی بہتان گردی کی تھی۔ حکیم کی تو ایک مثال ھے، ھمارا معاشرہ تو ایسی حرکتوں کے سیلاب کی زد میں ھے۔ غیبت، بہتان، تہمت یہ سگی بہنیں ھیں اور ھماری نیشنل بیماریاں بن چکی ھیں۔ شادیوں کی محفلوں، مرنے والوں کے لئے دعائیہ اجتماع، ٹی وی پروگرام، جہاں چار بندے اکٹھے ھوں تو غیبت اور تہمتوں کا سیلاب بہنا شروع ھو جاتا ھے۔ حسد کی بو میں لپٹی باتیں کر کر کے یہ لوگ تھکتے بھی نہیں۔ ایک لڑکی سے لے کر بوڑھے تک، سیاستدانوں سے لے کر مرنے والوں تک، کسی کو نہیں بخشا جاتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ھیں کہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا لیکن نیکیاں ھی مرنے کا بعد ساتھ جائیں گی اور حسد نیکیوں کو کھا جاتا ھے۔ صاف فرما دیا گیا ھے کہ کسی کے جھوٹا ھونے کیلئے یہ کافی ھے کہ وہ کوئی بات تصدیق کے بغیر لوگوں میں کرتا پھرے۔ کسی کی جھوٹی برائی بیان کی جائے تو بہتان، تہمت اور سچی کر دی جائے تو غیبت۔ ان لوگوں کو اس بات کی کیا پرواہ کہ جھوٹ بولنے سے لعنت نازل ھوتی ھے، اپنا بیڑا غرق ھوتا ھے۔ ان کو کیا احساس

کہ غیبت زنا سے بدتر ھے اور ان کی نیکیاں دوسرے کے نامہ اعمال میں منتقل ھو جاتی ھیں۔۔ تہمت، بہتان بازی کی تباہ کاریوں سے ان لوگوں کو کیا لینا دینا۔ ان کی تو زندگی کا اھم ترین مشغلہ ھی یہی ھے، جہاں موقع ملا لوگوں پر عیب سازی، تہمت سازی کے حملے شروع۔ یہ لوگوں کے پیچھے، ان جیسے لوگ ان کے پیچھے۔ عجیب تماشا لگا ھوا ھے اور میڈیا بھی اس وبا سے محفوظ نہیں ھے، جب مرضی جس پر مرضی حملہ کر دیا جاتا ھے۔ ملزم کو مجرم بنا کر پیش کر دیا جاتا ھے، بعد میں چاھے وہ ملزم باعزت بری ھو جائے لیکن میڈیا اس سے پہلے ھی اس کی عزت کا فالودہ بنا کر لوگوں میں بیچ کر پیسے بنا چکا ھوتا ھے۔ اگر کوئی بات اصلاح معاشرہ کے جذبہ سے یا برائی کی نشاندھی کر کے لوگوں کو برائی سے بچانے کی کوشش کرنے کیلئے کرنا ضروری ھو جو کہ کرنا بہت ضروری ھے، میڈیا کو بھی اور ھم سب کو بھی، تو مکمل تصدیق کے بعد پوری احتیاط اور ذمہ داری کے ساتھ ھی بات کرنی چاھئے، جو غیبت اور بہتان سازی کی زد میں نہ آتی ھو۔ اس بات کو ھم سب کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنا چاھئے۔ پرائم منسٹر پاکستان نے ریحام خان کی کردار سازی پر برھمی کا اظہار کیا اور منع کر دیا۔ سیاستدانوں کیلئے تعریف اور تقلید کا مقام ھے اور سیاست کا درست راستہ۔ کردار پہلی سیڑھی ھے انسانیت کی، ملک و قوم کی بہتری کی۔ اس بات پر مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ جنگ پبلشرز گروپ کے انچارج مظفر محمد علی اب اس دنیا میں نہیں ھیں، اکثر اپنے دفتر کی سیڑھیاں اتر کر میرے آفس میں آ کر بیٹھ جاتے، میرے ساتھ، میرے بھائی

کے ساتھ انتہائی شفقت فرماتے تھے، ھمارے ساتھ کھل کر بات کیا کرتے تھے، سب سے تعلق نبھاتے تھے لیکن بھٹوکے جیالے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی ایسا سیاستدان ھے جسے آج کے دور میں ملک اور عوام سے مخلص کہا جاسکے، اس سے کوئی اچھی امید رکھی جاسکے۔ جواب بڑا حیران کن تھا۔ انھوں نے اس وقت کی پیپلز پارٹی کی نفی کر دی اور بتایا کہ کچھ دن پہلے حرمین شریفین میں جلاوطن میاں نواز شریف سے ملاقات ھوئی ھے، ان میں ملک و قوم کا عجیب درد دیکھا ھے، انھیں دوبارہ حکومت ملی تو سیاست میں مثبت تبدیلی اور ملکی بہتری کی قوی امید ھے۔

پیشہ ور تہمت سازوں اور غیبت سازوں کو یہ بات یاد رکھنی چاھئے کہ عام آدمی ھو یا سیاستدان، برا آدمی ھو یا نیک، کسی کو اخلاقی طور پر، معاشرتی طور پر اور مذھبی طور پر کسی لحاظ سے یہ اجازت نہیں ھے کہ جس کو مرضی جھوٹ کی تلوار سے کاٹ دیے۔

میرے ایک دوست جنھوں نے ایک اپنی آبائی زمین بیچ کر اپنے کاروبار کو بہت بڑی رقم سے وسعت دی، ان سے کچھ نام نہاد صحافی انھیں کاروبار بدنام کرنے کی دھمکی دے کر ھر ماہ رقم لیتے رھے، ایک دفعہ بہت زیادہ رقم مانگ لی تو انھوں نے مجھے فون کیا، ھم دوستوں نے مناسب کوشش کی اور ان کی اس بلیک میلنگ سے جان چھوٹی۔ اسے لوگ بھی ھمارے معاشرے کا المیہ ھیں۔ اگر غیبت، بہتان، تہمت، بلیک میلنگ کرنے والے اپنی حرکتوں سے باز نہیں آنا چاھتے

تو یاد رکھیں کہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔ موت آنے والی ھے، قبر میں جا کر سب پتہ چل جائے گا اور کروٹ لیتے پاکستان میں یہ بھی ممکن ھے کہ آپ کو اپنی حرکتوں کا خمیازہ اسی پاکستان میں بھگتنا پڑے۔ بہتری اسی میں ھے کہ توبہ کر کے ایک اچھی زندگی گزاری جائے۔

ٹی وی پروگراموں میں خود ساختہ دانشور صاحبان کے ساتھ اچھے لوگ بھی نظر آتے ھیں، لیکن سماجی برائیوں کے خلاف اٹھتی آوازیں بہت کمزور ھیں، ان کو بہت زیادہ توانا کرنے کی ضرورت ھے۔ ان سماجی برائیوں کے متعلق بھی عام پروگرام ھونے چاھئیں۔

بچے، جانور اور پرائیویٹ ملازمین

حیرت ھے پاکستان میں بچوں کے حق کیلئے کسی نے بات کی ھے اور کرنے والی شخصیت عام بھی نہیں ھے۔ ھمارے ملک میں تو اگر حقوق کی بات ھو تو بچوں، جانوروں اور پرائیویٹ ملازمین کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ تقریروں کے اندر اگر والدین کے حقوق کی بات کی جاتی ھے اور بچوں کا نام تک نہیں ھوتا۔ لاھور میں چھ چھوٹے بچے مر گئے، پورے میڈیا میں کہیں بھی ایسا سننے میں نہیں آیا کہ ان ماں باپ سے پوچھا گیا ھو کہ وہ ان چھوٹے بچوں کو اکیلا کیوں چھوڑ کر گئے تھے، رات کے وقت بچوں کی نگہداشت سے غفلت برتتے ھوئے ماں کا غائب ھونا کیا ایک جرم نہیں ھے، کیا کوئی ایسا قانون بنایا جا سکتا ھے کہ آئندہ کوئی ماں ایسی غفلت نہ برت سکے، اسے پتہ ھو کہ حکومت سزا دے گی۔ لیکن قانون تو تب بنے گا جب بچوں کے حقوق کا کسی کو خیال ھو۔ گورے بھی ھم جیسے لوگ ھیں۔ ایک خاتون نے مجھے خود بتایا کہ وہ جب امریکہ کے ایک ھسپتال میں پیدا ھوئیں تو چوتھی بیٹی ھونے پر اور بیٹا نہ ھونے پر ماں نے منہ پھیر لیا۔ نرس نے یہ بات نوٹ کی اور ڈاکٹر کو بتا دیا، ھسپتال انتظامیہ نے والد کو بچی دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ بچی کی والدہ کو بچی سے نفرت ھے، بچی کو نقصان کا اندیشہ ھے۔ والد نے کافی لکھت پڑت کر کے، گارنٹی دے کر اپنی ذمہ داری پر بچی لی۔ ایسا اس لئے ھوا کہ بچوں کے

حقوق کا ادراک اس معاشرے میں موجود ھے اور بچوں کے حقوق کو قانونی تحفظ حاصل ھے۔ بڑے عہدے والے، امیر لوگ اور نامور لوگ ھمارے ملک میں حق رکھتے ھیں، لیکن بچے، جانور اور پرائیویٹ ملازمین ایک درخت کے ٹوٹے پتے کی مانند ھیں جسے ھوا جہاں مرضی لے جائے، جن کو جو چاھے جب مرضی روند کر چلا جائے۔

اگر کوئی بچوں کے لئے بنائے گئے سکولوں کا حوالہ دے کر یہ کہنا چاھیں کہ کام ھو رھا ھے تو عرض ھے کہ بہت سارے آٹے میں تھوڑا سا نمک ھو تو وہ آٹا ھی کہلاتا ھے، اسے نمک نہیں کہیں گے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں بہت سارے کام ان بچوں ھی سے لئے جاتے ھیں۔ تپتی دھوپ میں ٹریفک کے اشاروں پر ننگے سر، کندھے پر صافہ رکھے پانی کی ایک چھوٹی بالٹی اٹھائے گاڑیوں کے شیشے صاف یہ بچے ھی کرتے ھیں۔ ھوٹلوں میں برتن دھونے اور بیرا گیری کرنے میں یہ بچے پیش پیش ھیں۔ اپنی آنکھوں سے بچوں کو سامان سے لدی ریڑھیوں کو چلاتے بچپن سے دیکھ رھا ھوں۔ مشینوں پر کام کرتے دیکھا ھے۔ ان پر وحشیانہ تشدد ھوتے دیکھا ھے۔ گوروں کے بچوں کو گھر میں کوئی مارے تو وہ سکول میں یاد کروائے گئے نمبر ملا کر شکایت کرتے ھیں اور ان کی شکایت کا پورا ازالہ کیا جاتا ھے اور ھمارے یہاں ماں کو خاوند سے ڈانٹ پڑے تو وہ بچوں کی پٹائی کر کے اپنا غصہ نکالتی ھے، والد کو کھلی آزادی ھے کہ وہ جب مرضی بچوں کے ساتھ جلاد کا روپ اختیار کر لے۔ کوئی اس کا ھاتھ روکنے والا نہیں۔ وہ وقت بھی دیکھا ھے کہ جب ان بچوں کیلئے بولنے کا موقع ملا تو بمشکل ایک آدھی آواز کو ھمنوا پایا

اور مشورے دینے والے بہت پائے لیکن ھر کسی کا مشورہ ایک، کہ چھوڑو یار بچے ھیں ان کی خاطر پنگا نہ لو اور آپ اگر بولیں گے تو بچوں کے ساتھ جانوروں کا سلوک کرنے والے والدین آپ کے خلاف اپنی پرسنل لائف میں مداخلت کا الزام عائد کر دیں گے۔

اگر قانون ھوتا تو سب کا دماغ ٹھکانے رھتا۔ آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک دیکھیں تو بچوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے سخت قانون موجود ھے، وھاں بچوں کو عزت ملتی ھے اور یہ بچے بڑے ھو کر افراد بنتے ھیں اور انھیں افراد سے معاشرہ بنتا ھے اور ایسا معاشرہ بنتا ھے کہ پاکستان کے لوگ پاکستان کی بجائے وھاں رھنے کو ترجیح دیتے ھیں۔

پاکستانیوں کیلئے اگر باھر کی امیگریشن مفت کھول دی جائے تو شاید یہاں چند لوگ ھی رہ جائیں گے۔

پاکستان میں زیادہ لوگ مڈل کلاس اور غریب ھیں، ان کے بچوں کو اگر تعلیم میسر ھے تو وہ ایسی تعلیم ھے جو معیار کے بغیر ھے۔ بات ھونی چاھئے اور کام بھی ھونا چاھئے، کوئی بھی کرے۔ محترمہ ریحام خان نے بات کی ھے تو امید ھے کہ اس پر منظم انداز میں کام بھی جاری رکھیں گی، اگر کام جاری رھا، بات تقریروں سے آگے چلتی رھی تو بہت سارے درد مند لوگ ان کے اس کام کی حمایت کیلئے نکل آئیں گے۔

آجکل تو گدھے، گھوڑوں کا گوشت بکنا شروع ھو گیا، کوئی زخمی گدھا گھوڑا سڑک پر

لاوارث پڑا کم ھی نظر آتا ھے لیکن پرانی بات ھے، میں، میرا بھائی، ھمارے ھم خیال احباب راستے میں پڑے جانوروں کو نار فائونڈیشن کے پلیٹ فارم سے گھوڑا ھسپتال لے کر جاتے رھے ۔ اس ھسپتال کی حالت انتہائی خراب اور ارباب اختیار کی توجہ کے اور احتساب کے قابل ھے۔ کچھ عرصے بعد ھمیں بروک ھسپتال کا پتہ چلا کہ وھاں جانوروں کا فری علاج ممکن ھے، چنانچہ میں اگلی دفعہ سڑک کنارے سے ایک زخمی گدھے کو اٹھا کر بروک ھسپتال پہنچ گیا۔ انتہائی دکھ کا سامنا کرنا پڑا جب ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ لاوارث گدھے کے علاج پر ھمیں مخالف قانونی کاروائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں نے فارم پر کر دئے اور علاج شروع ھو گیا، بالکل فری اور تسلی بخش علاج، بے مثال انتظامات کے ساتھ ۔ بروک ھسپتال کی مالکہ ایک خاتون ھیں جن کا تعلق برطانیہ سے ھے اور دینا کے مختلف حصوں میں جانوروں کیلئے بے مثال خدمات سر انجام دے رھی ھیں۔ کچھ عرصے بعد بروک کے ایک فیلڈ آفیسر ھمارے بارے میں پوچھتے پچھاتے میرے پاس پہنچ گئے اور انتہائی حیرانگی کے ساتھ انھوں نے بتایا کہ میں صرف یہ دیکھنے آیا تھا کہ لاھور میں ایسے کون لوگ ھیں جو جانوروں کیلئے کام کر رھے ھیں۔ کبھی ایسا دیکھا نہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ ھم تو نار فائونڈیشن کے پلیٹ فارم سے بچوں کیلئے ٹینٹ سکول لگاتے ھیں اور جانوروں کی حالت دیکھتے ھیں تو پریشانی ھوتی ھے، جو کر سکتے ھیں کرنے کی کوشش کرتے ھیں۔ پاکستان میں عوامی سطح پر جانوروں کا احساس موجود ھے، اگر ھمارے ملک کے بااثر لوگوں میں بھی یہ درد

پیدا ھو جائے تو بہت اچھا کام ھو سکتا ھے۔ مجھے یاد ھے ھم نے کیمپ میں کچھ جانور دیکھے تھے جو لاوارث تھے اور مختلف لوگوں نے ان کو اپنا رکھا تھا اور ان کے کھانے پینے اور علاج بمعہ رھائش کے تمام اخراجات وھی لوگ ادا کرتے تھے اور ان میں سے کچھ جانوروں کو فریال گوھر اداکارہ نے اپنا رکھا تھا اور تمام اخراجات وھی ادا کرتی تھیں۔ کتنا اچھا ھو کہ کوئی بااثر شخصیت آگے بڑھے اور جسطرح ریحام خان نے بچوں کیلئے آواز بلند کی ھے، وہ جانوروں کیلئے میڈم بروک کی طرح آواز بلند کریں اور جانوروں کے حقوق کیلئے بھی کام شروع ھو سکے۔ بروک ھسپتال کے تعاون سے مزید ھسپتال بھی بنائے جا سکتے ھیں۔

اور پرائیویٹ ملازمین کیلئے جتنا بھی رویا جائے، بلکہ آنسوئوں کی بجائے خون سے رویا جائے تو کم ھے۔ پاکستان میں کام کرنے والے کل ملازمین کا سب سے بڑا حصہ پرائیویٹ ملازمین کا ھے اور پرائیویٹ ملازمین کی ایک بڑی تعداد کا حال لاوارث کتے جیسا ھے۔ بڑی بڑی باتیں کرنے والے حکومت اور اپوزیشن کے افراد ھوں یا معاشرے کے دوسرے بڑا قد رکھنے والے افراد، پرائیویٹ ملازمین کے حقوق کے تحفظ کیلئے کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی۔ اگر کہیں بات ھوئی بھی ھے تو اتنی کمزور کہ وہ بات آگے نہ بڑھ سکی اور بس رات گئی بات گئی ھو گئی۔ تنخواھیں بڑھتی ھیں تو سرکاری ملازمین کی اور سہولتیں بھی صرف سرکاری ملازمین کیلئے ھیں۔ سوشل سیکورٹی، اولڈ ایج بینیفٹ، لیبر کے حقوق کے تحفظ کے

نام پر متعلقہ سرکاری عملہ کیا کر رہا ھے، یہ کہانی ارباب اختیار کی نظر سے محروم ھے۔ اگر ایک فیکٹری میں ایک ھزار ملازم ھیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں کہ سرکاری کاغزات میں وہ تعداد بہت کم کیوں لکھی ھوئی ھے اور اس کم تعداد میں سے بھی سوشل سیکورٹی، اولڈ ایج بینیفٹ کارڈ صرف کچھ ورکروں کے کیوں بنے ھیں۔ فیکٹریوں میں اکثر بچے بھی اور لڑکیاں، جوان سب کام کرتے ھیں، یہ بارہ گھنٹوں کے چھ سے آٹھ ھزار کیوں لے رھے ھیں۔ ایک سرکاری سکول کا استاد سہولیات کے ساتھ کم از کم تنخواہ بیس، تیس ھزار روپے لے رھا ھے تو پرائیویٹ سکولوں کے اساتذہ بغیر کسی سہولت کے زیادہ سے زیادہ تنخواہ چھ سے آٹھ ھزار روپے کیوں لے رھے ھیں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں اچھی تنخواہ دینے والے گنتی کے صرف چند ھی ادارے ھیں۔ سرکاری دفاتر میں چپڑاسی اگر تقریبا بیس ھزار روپے تنخواہ لے کر آٹھ گھنٹے ڈیوٹی کرتا ھے تو پرائیویٹ دفاتر میں چپڑاسی آٹھ، دس ھزار میں شام تک کام کیوں کرتا ھے۔ اکثر بنکوں کا عملہ بنا اوور ٹائم کے آٹھ گھنٹے گذرنے کے بعد بھی شام تک دفتر میں کیوں کام کرتا ھے۔ پرائیویٹ دفاتر، فیکٹریوں کے گارڈ بارہ گھنٹے ڈیوٹی کیوں کرتے ھیں، ان کی تنخواھیں بہت کم کیوں ھیں۔ گھروں میں کام کرنے والی عورتیں، مزدور اور کتنے دوسرے لوگ ھیں۔ رمضان آنے والا ھے پھر عید بھی، کوئی میڈیا والا ذرا ان کے گھروں میں جا کر رپورٹ تو کرے، ذرا بتائے تو سہی کہ یہ لوگ کپڑے کب اور کیسے سلواتے ھیں۔ کھانا کیسے اور کیا کھاتے ھیں۔ کوئی ذرا ان کے بچوں کی حالت تو دکھائے ٹی

وی پر۔ کوئی پتہ تو کرے کہ یہ کب کام پر جاتے ھیں اور کب آتے ھیں، بیماری میں یہ لوگ کیا کرتے ھیں کوئی سوچنے کی کوشش تو کرے۔ مشکلات غریبوں کی بھی ھیں لیکن سفید پوش طبقہ ایک عجیب ظلم کا شکار ھے۔ ان کیلئے نہ تو سہولتیں ھیں اور نہ ھی ان کی تنخواھیں اچھی ھیں، کسی کو ان کا کوئی احساس نہیں، نہ ڈھنگ سے جی سکتے ھیں نہ مر سکتے ھیں۔ نہ لڑ سکتے ھیں، نہ ھاتھ پھیلا سکتے ھیں۔ اس ملک کے مختلف اداروں میں جا کر کام کرنا اور کام کرکے بھی اپنی اور اپنی فیملی کی بنیادی ضروریات کیلئے سسکتے رھنا ان کی مجبوری ھے اور اب تو عادت بن گئی ھے اور ان مجبوریوں کی وجہ سے خودکشیاں بھی ھو جاتی ھیں جو بہرحال حرام ھے۔ چند اچھی کمپنیوں یا پرائیویٹ اداروں کے مناسب حالات اونٹ کے منہ میں زیرہ جیسے ھیں۔ کیا ھی اچھا ھو کہ محترمہ ریحام خان نے اگر بچوں کے درد کو محسوس کیا ھے تو وہ جانوروں کے بارے میں سوچیں، پرائیویٹ ملازمین کے مسائل پر غور کریں اور ان کیلئے کچھ کر گزریں یہ بہترین سیاست ھو گی اور مجبور بے بس انسانوں اور جانوروں کے حقوق کا تحفظ ان کے لئے دنیا اور آخرت میں بے مثال فائدے کا سبب بھی بن سکتا ھے۔ ھمارے معاشرہ اچھے لوگوں سے خالی ں میں ھوا۔ ھم نے ٹینٹ سکول لگانے شروع کیئے تو لمپز انسیٹیوٹ کے طلبا طالبات سخت گرمی میں ایک لمبا سفر طے کرکے آتے اور ھر اتوار کو کئی گھنٹوں چھوٹے چھوٹے بچوں کو بنیادی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی کوشش کرتے، پسینے سے شرابور ان استادوں نے یہ سب کام ھمیشہ مفت کیا اور کبھی بھی

پیسوں کی ڈیمانڈں میں کی۔ ھم جانوروں کیلئے کوشش کرتے تو ھماری ایک کال پر گھوڑا ھسپتال کی سٹوڈنٹس اپنے کرایے اور وسائل پر ھمارے پاس پہنچ جاتے اور کئی جانوروں کا علاج فیلڈ میں ممکن ھو سکا۔ یہ لوگ ھمیں کام کرتا دیکھ کر خود سے ھمارے ساتھ لگ گئے تھے۔ کیا ھی اچھا ھو کہ ریحام خان اپنے ٹی وی پروگرام میں

بچوں، پرائیویٹ ملازمین کے حقوق کے بارے میں عوامی آگاھی کا سلسلہ شروع کریں۔

بچوں کے اسلام میں حقوق کا پرچار کریں۔ جانوروں کی حالت زار پر اسلامی تعلیمات کے حوالے سے پروگرام کریں۔ اپنی آواز کو اور بلند کریں اور سپریم کورٹ میں

بچوں، پرائیویٹ ملازمین کے حقوق کے تحفظ کیلئے کیس دائر کریں۔ کیا ھی اچھا ھو کہ حکومتی ایوانوں سے پارلیمنٹ میں بچوں، پرائیویٹ ملازمین اور جانوروں کیلئے قانون سازی کی توانا آوازیں سننے کو ملیں۔ جو بھی ایسا کرے گا وہ بچوں، پرائیویٹ ملازمین اور جانوروں کے رب ذوالجلال سے اجر اور انعام بھی پائے گا۔ ھے کوئی اس اجر اور انعام کو پانے والا؟

کون سمجھے، کون کرے؟ قسط - 1

چھوٹے چھوٹے پھولوں جیسے بچے گھروں کی رونق ھیں اور آنے والے کل میں یہ اس ملک کی رونق ھیں، ھمارا بے حد قیمتی سرمایہ ھیں۔ بچے سب کو اچھے لگتے ھیں سوائے سنگ دل لوگوں کے۔ آج کے بچوں اور آج سے 50 سال پہلے اور اس سے بھی پہلے کے بچوں میں عادات کا بہت فرق ھے اور اس فرق میں ایک بات یہ بھی ھے کہ آج کے اکثر بچے اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بغیر وجہ کے مار کٹائی کرتے نظر آتے ھیں۔ والدین کے ساتھ بھی حسب استطاعت لڑائی ھوتی ھے۔ پہلے بچوں میں یہ بات کم تھی اور ایک نارمل لیول تک ھوا کرتی تھی، لیکن آجکل یہ ایک پریشانی بن رھی ھے۔

حالت یہ ھے کہ جب لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے ھیں تو اکثر مائیں دوسری ماؤں سے ایک بات ضرور پوچھتی ھیں، آپ کے بچے آپس میں لڑتے ھیں ؟ جواب ملتا ھے جی ھاں بڑا تنگ کرتے ھیں۔ یہ جواب سن کی پوچھنے والی ماں شاید دل ھی دل میں اپنے آپ کو تسلی دے لیتی ھے کہ یہ تو میرے بچوں جیسے ھی ھیں۔ پھر تبادلہ خیال اسطرح کیا جاتا ھے کہ میرے بچے بھی بہت لڑتے ھیں، آجکل سب بچے ایسے ھی ھیں۔ ان کو کون سمجھائے کہ بچے نہیں آجکل کے ماں باپ آپ جیسے ھو گئے ھیں اور اکثر بچوں کا رجحان تعمیری کی بجائے تخریبی آپ خود بنا رھے ھیں جس کا سدباب بہت ضروری ھے۔

آج کے اکثر بچوں کی طوفانی عادتوں کا اکثر حصہ یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ھے کہ بچے ھیں ٹھیک ھو جائیں گے اور اگر ان کے اس رویے کے بارے میں فکر مندی پیدا ھو بھی جائے تو والدین کے احمقانہ لاڈ پیار کی نظر ھو جاتی ھے۔ یہ بچے آرام سے نہیں بیٹھتے،ادھر ادھر بھاگتے پھرتے نت نئی شرارتیں کرتے ھیں، یہ بچوں کا فطری رویہ ھے لیکن اکثر بچوں کا یہ رویہ حد سے بڑھا ھے اس لئے نقصان دہ ھے۔ اگر یہ ایک نارمل حد تک ھوتا تو ھم اسے تعمیری رویہ سمجھ سکتے تھے۔اس تعمیری سے تخریبی رویے کی وجوہات ھمارے گھروں میں موجود ھیں اور یہ خوامخواہ نہیں ھیں۔ بچوں کی بہتری اور معاشرے کی بہتر تشکیل کے حوالے سے ان وجوہات کو سمجھنا اور ان کا سدباب بہت ضروری ھے۔

اشارۃ عرض ھے۔

کہ آج کی ماں کے رویے میں بہت تبدیلی آ چکی ھے۔ مائیں بچوں کو بہت کم توجہ دیتی ھیں۔ تقریبا 5 سال تک بچے کی شخصیت پر لاشعوری کیفیت کا غلبہ ھوتا ھے اور 5 سال تک بچہ جانتا اور سیکھتا رھتا اور 5 سال بعد بچہ شعور کا بھرپور استعمال سیکھتا ھے،جس کی بنیاد اس کے لاشعوری مشاھدات ھوتے ھیں اور 5 سال میں بچہ شعوری دنیا میں مکمل طور پر قدم رکھ پاتا ھے،جو سیکھا ھوتا ھے

اس کی عملی تجربات کرنا شروع کرتا ھے۔ 5 سال سے پہلے لاشعوری کیفیت غالب ھوتی ھے۔ اس عمر میں بچہ اپنے ارد گرد کے ماحول کے اثرات کو اپنے اندر جذب کرتا ھے جو دیکھتا ھے اپنے لاشعور میں اپنی استطاعت کے مطابق محفوظ کرتا چلا جاتا ھے۔ مثلا چھوٹے بچے آگ، گرم پانی پر فورا ھاتھ ڈال سکتے ھیں اور ایک دفعہ اگر ھاتھ ڈال کر تکلیف برداشت کر لی تو بجائے محتاط ھونے کے ان کی دلچسپی آگ، گرم پانی میں بڑھ جاتی ھے، آپ دوبارہ ان کو آگ، پانی کے پاس چھوڑیں یہ دوبارہ پھر ھاتھ ڈال دیں گے۔ یہ سیکھنے کی لاشعوری حس ھے۔ اونچی جگہ سے نیچے گر کر وہاں سے بچنے کی بجائے دوبارہ وہاں جا کر کھڑے ھو جائیں گے۔ یہ آپ کو کچھ سوچتے نظر آئیں گے اور سوچتے سوچتے دوبارہ گر جائیں گے۔ لیکن اگر بچہ ھر وقت ماں باپ کی مکمل نگہداشت میں ھے اور بچے کے بارے میں لاپراوئی نہیں ھو رھی تو بچے کی ھر لمحہ کی تربیت جاری رھے گی بچہ گرنے کے ساتھ بچنا بھی سیکھے گا اور یہ بھی اس کے لاشعور میں محفوظ ھو جائے گا۔

کون سمجھے، کون کرے ؟ قسط 2

5 سال تک بچے کی بہترین تربیت اس کی ماں کے ھر لمحہ ساتھ ر ھنے اور ماں کے جان مارنے سے ھوتی ھے، پھر باپ کا گہرا اثر اور گھر کے دوسرے افراد کی صحبت کا اثر بھی کچھ اثر ھوتا ھے۔ اگر والدین بچوں کے سامنے آپس میں لڑیں گے اور تو تکار کریں گے تو بچہ اس کا بھی اثر لے گا۔ بچے کے ساتھ بیٹھ کر انڈین فلمیں ،ڈرامے دیکھیں گے تو بچہ بھی اثر لے گا اور تباہ کن اثر لے گا۔ اچھی تربیت ایک سمجھدار ماں اور باپ سے ممکن ھے ورنہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی کے مطابق تربیت ھو گی اور اوٹ پٹانگ ھو گی جس میں اچھائی کا پہلو تو ظاھر ھے، نہیں ھو سکتا۔

جیسے ایک بچے کو تمام بچپن کھڑا کروا کر پیشاب کروایا گیا اور بعد میں کبھی طہارت بھی نہیں کروائی گئی، محض اپنی آسانی کیلئے کیونکہ اسطرح ماں کو محنت نہیں کرنی پڑتی، تو بڑے ھو کر وہ اسی طرح پیشاب کرنے میں زیادہ ذھنی آسانی محسوس کرے گا۔ ایک بچے نے ماں باپ کو لڑتے دیکھا،کارٹون فلموں میں لڑائی دیکھی، تھوڑا بڑا ھوا تو انڈین فلمیں ، ایکشن فلمیں دیکھیں اس بچے سے نرم گفتار اور عقلمندی کی توقع کیونکر کی جا سکتی ھے اور یہ جو بچوں کو اپنے

دودھ کی بجائے بغیر کسی طبّی وجہ کے مکمل طور پر ڈبوں کا دودھ دینے کا رواج چل نکلا ھے ، میڈیکل سائنس کے مطابق ماں کا دودھ جان بوجھ کر نہ پلانے کے بچے کی صحت پر برے اثرات پڑتے ھیں۔ یہ بھی بچوں کے ساتھ ایک بہت بڑا ظلم ھے جو ان کی مہربان مائیں ان کے ساتھ کرتی ھیں۔

ماں کی ھر وقت بچے پر نظر اور تحمل سے اس کے بھولے سوالوں کا اچھا جواب دینا، پیار سے اس کے ساتھ اچھی باتیں کرنا ، بچے کی بہترین تربیت کا ایک اھم عنصر ھے۔ آج کی سائنس اس بات کی تصدیق کر رھی ھے کہ بچہ ماں کے پیٹ ھی سے ماں کے کھانے پینے،ماں کی عادات واطوار کا اثر اپنا رھا ھوتا ھے۔ ماں کو بچے کے حوالے سے کیسا ھونا چاھئے، اس کی تفصیل اسلامی لٹریچر میں موجود ھے، لیکن اگر کوئی استفادہ کرنا چاھے۔

اچھی مائیں--------اچھی اولاد---------اچھا معاشرہ

اسلام میں تلقین کی گئی کہ شادی کرو تو دیندار عورت سے۔ اس ھدایت کی تشریح میں سے بچوں کے حوالے سے ایک مطلب یہ بھی ھے ایک اچھی اور سمجھدار عورت،اچھے کردار والی۔ جو عورت اعلی کردار کی مالک ھو گی۔ اس کا فائدہ اس کے خاوند کو ذاتی طور پر تو جو ھو گا سو ھو گا لیکن اس عورت کا اعلی کردار

بچے کے لاشعور اور لاشعور سے بچے کے شعور میں منتقل ہو جائے گا۔
عام طور پر فاحشہ عورت کی بیٹی فاحشہ اور شریف عورت کی بیٹی شریف ہی ہوتی ہے۔
اچھی مائوں کے اچھے بچے جب بڑے ہو کر معاشرے کے افراد بنیں گے تو ایک بہتر اور اچھا معاشرہ تشکیل پا سکے گا۔
،جاری ہے

کون سمجھے، کون کرے ؟؟؟ قسط 3

تاریخ کا مطالعہ کریں تو اھل اسلام کی عظیم شخصیتوں کی مائوں کے حیرت انگیز اور مثالی کردار کا پتہ چلتا ھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ نے رات کے گشت کے دوران ایک لڑکی کو اپنے گھر میں اللہ کریم جلا جلالہ کے ڈر سے دودھ میں پانی ملانے سے ڈرتے اور ڈراتے سنا، صرف آواز سنی، دیکھا نہیں تھا بس اسی بنیاد پر اپنے بیٹے کو منا کر اس لڑکی کا رشتہ اپنے بیٹے کیلئے مانگ لیا۔ کس لئے ؟ یقینا اپنی نسل کے اچھا ھونے کی خواھش ضرور رھی ھو گی۔ اس ماں رضی اللہ عنہا کی سمجھداری اور اچھے کردار کا اثر یہ ھوا کہ ان کی اولاد میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ پیدا ھوئے، جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ھے کہ انھوں نے زمین کو انصاف سے بھر دیا۔

مسلمانوں کا شاندار ماضی گواہ ھے کہ دین سے سمجھداری آتی ھے اور یہ سمجھداری دین سے ماں میں اور ماں سے بچوں میں منتقل ھو جاتی ھے۔

پاکستان بھی تو اللہ کریم جلا جلالہ اور مدینے کے تاجدار صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کیلئے بنایا گیا تھا۔ یہی ھمارا دو قومی نظریہ تھا اور ھے جو

بچوں کو پڑھاتے تو ضرور ھیں لیکن چند سطور کی حد تک اور دکھاتے کارٹونوں کی لڑائیاں ھیں۔ شتر بے مہار کی طرح بچے کھاتے پیتے بڑے ھو جاتے ھیں۔ پورے بچپن میں جس مقصد کیلئے پاکستان بنایا گیا تھا، وہ مقصد تو بچوں کو سکھایا ھی نہیں جاتا تو پھر بچوں میں اچھا کردار، اچھائیاں کہاں سے آنی ھیں یہ تو اسی دو قومی نظریے کی پیروی میں آنی تھیں جسے ھم نے بچوں کی اور اپنی زندگی سے غائب کر دیا۔

آج ھمارے ملک میں سرکاری طور پر بچے کو اٹھارہ سال کی عمر میں بالغ سمجھا جاتا ھے اور محمد بن قاسم رحمتہ اللہ تعالی علیہ نے جب ھندوستان میں انسانوں کے ساتھ ھونے والے المناک مظالم کا خاتمہ کرکے انصاف اور محبت کے نظام نافذ کیا تو ان کی عمر سولہ، سترہ سال تھی اور ان کے اکثر ساتھی بھی کم عمر تھے۔ ان کی تربیت کیسے کی گئی ھو گی ذرا سوچنے، سمجھنے کا مقام ھے۔

منقول ھے، مفہوم، قیامت والے دن جہنم کا حکم پانے والے کچھ افراد اپنے باپ کا دامن پکڑ لیں گے اور فریاد کریں گے کہ ھمارے باپ کو ھمارے ساتھ جہنم میں بھیجا جائے کیونکہ اس نے ایک ایسی عورت سے شادی کی، جس نے ھماری اچھی تربیت ں میں کی۔ اگر ھمارا باپ کسی اچھی عورت کو ھماری ماں بناتا تو ھم اچھی تربیت لے کر اچھے کام کرتے اور آج ھم گناھوں بھری زندگی کی وجہ سے جہنم میں نہ

جاتے۔

اچھی تربیت ھو گی تو بچہ بڑا ھو کر خود بھی سکون میں رھے گا، اس کے ماں باپ بھی، اس کی بیوی بھی اور معاشرہ بھی۔

اور یہ واقعہ بھی شاید آپ کی نظر سے گذرا ھو۔ جب ایک ڈاکو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی، اس سے اس کی آخری خواھش پوچھی گئی تو اس نے اپنی ماں سے ملنا چاھا۔ ماں سے ملوایا گیا تو اس نے ماں کو نوچنا شروع کر دیا۔ اس سے اس حرکت کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ آج میں ڈاکو ھوں تو اپنی اس ماں کی وجہ سے ھوں کیونکہ جب میں بچپن میں سکول سے پنسل چرا کر لایا تھا، میری ماں نے مجھے منع نہیں کیا تھا۔ یہی بات میرے جرائم کی بنیاد بنی۔ جوں جوں میں بڑا ھوتا گیا، میری عادت پختہ ھوتی گئی اور میں ڈاکو بن گیا۔ اگر میری ماں بچپن میں مجھے روک دیتی تو آج میں ایک اچھا انسان ھوتا۔ تعلیم سکول میں لیکن تربیت ماں کی گود سے ھوتی ھے۔

جاری ھے، اگلی قسط پڑھیں۔

کون سمجھے، کون کرے ؟؟؟ قسط 4

ایک اور روایت کا مفہوم ھے کہ جس لڑکے، لڑکی کی شادی کی عمر ھو جائے اور ماں باپ ان کی شادی نہ کریں ، اب اگر وہ زنا میں مبتلا ھوں تو ماں باپ کے اوپر بھی اس کا وبال ھو گا اور اگر بچہ اگر اچھے کام کرے تو والدین کو بھی اس کا ثواب ملے گا۔ ذرا ملاحظہ کریں کہ بچے کے کردار کی ذمہ داری کا ماں باپ سے کتنا گہرا تعلق ھے کیونکہ بچے کی تربیت کی ذمہ داری ماں باپ کی ھے اور اگر انھوں نے ایمانداری سے کوشش کی تو پھر بھی وہ بری الزمہ ھو سکیں گے۔ دنیا کی کوئی قوم دیکھ لیں ان کے بچوں میں ان کی قومیت، ثقافت جھلکتی نظر آئے گی لیکن ھمارے بچوں میں نظر آئے گی تو اوٹ پٹانگ ثقافت اور اس کی وجہ ماں باپ خود ھیں۔

50 سال یا اس سے پہلے کی مائوں کے پاس بچوں کیلئے وقت اور توجہ موجود تھی۔ بچے ان کی ترجیح ھوا کرتے تھے۔ وہ گھر کے کام کرتیں تو بچوں سے کبھی غافل نہیں ھوتیں۔ بچوں کو پل پل کی راھنمائی، حفاظت، توجہ ملتی اور وہ دیکھ دیکھ کر، سن سن کر سیکھتے رھتے۔ مائیں بچوں کے ساتھ جان مارا کرتی تھیں۔ بچوں کو ھر پل کا پیار پر اعتماد بنا دیتا تھا۔

آجکل غریبوں کے گھروں کو چھوڑ کر اکثر گھروں میں مائوں کی اکثریت ایسی ھے کہ گھر میں صفائی کیلئے ،ملازمہ ھے ،برتن ،ملازمہ دھو دیتی ھے۔ کپڑے دھونے کیلئے مشینیں ھیں اور یہ بھی ،ملازمہ کی ذمہ داری ھے۔ مائوں کو بس کھانا بنانا ھوتا ھے اور امیر گھروں میں تو وہ بھی خانسامہ بناتا ھے۔ مائیں تقریبا فارغ ھوتی ھیں۔ ایسی صورتحال میں بچوں کی تربیت بہت اچھی ھونی چاھئے تھی اور بچوں کیلئے پیار اور توجہ کی کمی ھر گز نہیں ھونی چاھئے تھی لیکن آج کی مائوں نے اپنی بہنوں، سہیلیوں کے ساتھ فون پر لمبی لمبی باتیں کرنی ھوتی ھیں۔ فون سے جان چھوٹے تو فلمیں، ڈرامے جان نہیں چھوڑتے تو بیچارے بچے کیلئے کتنا وقت بچے گا۔ بچے والدہ سے نہانے اور کھانے کے علاوہ اپنی تربیت کا اکثر حصہ کارٹون دیکھ کر حاصل کرتے ھیں۔ ماں اپنے بچوں کو خود فارغ رھنے کیلئے باقائدہ کارٹونوں کا عادی بناتی ھے۔ ذرا سوچیں ایک بھولا بھالا بچہ جسے ابھی دنیا کا پتہ بھی نہیں ھے وہ کارٹون دیکھ کر کیا سیکھے گا۔ بھولے ذھن والا بچہ جب ھر وقت کارٹون دیکھتا ھے تو یہ اس کے دل و دماغ میں بس جاتے ھیں۔ اکثر بچوں کو تو خواب میں یا جاگتے میں یہ کارٹون نظر آنا شروع ھو جاتے ھیں۔ عینک بھی جلدی لگ جاتی ھے۔ یہ کارٹون آپس میں ھر وقت لڑائی کرتے ھیں اور بھولے بچے یہ دیکھ کر لڑاکے کارٹون جیسا رویہ اپنا لیتے ھیں۔ یہ کارٹون جسطرح بولتے ھیں بچے بھی وھی لہجہ سیکھ جاتے ھیں اور لوگ کہتے

ھیں کہ بچے بڑے بد تمیز ھیں۔ کچھ مائیں تو ملبہ اپنے خاوند کے خون پر ڈال دیتی ھیں کہ خون ھی ایسا ھے۔ چھوٹا بیم ،ٹام جیری اور اسطرح کے دوسرے کارٹون بچوں کو حقیقی دنیا سے دور اوٹ پٹانگ خیالی دنیا میں لے جاتے ھیں۔ یہ کارٹون بچوں میں خوابوں، خام خیالی اور مارکٹائی کی تبلیغ ھیں اور اگر اس کو خالص مذھبی نکتہ نظر سے دیکھیں تو صورتحال انتہائی خطرناک ھے۔ سارے نہیں لیکن بچوں کی اکثریت ان کارٹون کی شوقین کر دی گئی ھے ۔ ان کارٹونوں میں بچوں کے بھولوں ذھنوں میں جس زندگی کا نقش بنیاد بناتا ھے وہ لڑائی جھگڑے والی زندگی ھے۔ وہ مرد عورت کے اختلاط والی زندگی کا تصور ھے اور کوئی اس اختلاط بھری زندگی کا بھیانک نتیجہ دیکھنا چاھے تو مغربی معاشرے کا بغور مشاھدہ کرلے،اس کے بھیانک نقصانات بتانے کیلئے ایک علیحدہ تحریر لکھنے کی ضرورت ھے۔

اس کے علاوہ کارٹون فلم میں جو لڑائی جھگڑا ھے،اس کو بہت احتیاط سے سوچنے سمجھنے کی ضرورت ھے۔ ایک بچہ لڑائی جھگڑے کی تعلیم پا کر جب بڑا ھوگا تو ذرا سوچیں اس کا اپنے ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچوں سے کیسا رویہ ھوگا۔ جب اس کے ذھن میں کوئی تعمیری بنیاد بنائی ھی نہیں گئی تو بڑا ھو کر کیا تعمیری کام کرسکے گا۔ بڑا تیر مارے گا تو کوئی ڈگری لے لے گا لیکن کوئی بڑا تعمیری کام کرنے کے قابل نہیں ھوگا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں تو کارٹون

سے ملنے والی تربیت کے نتیجے میں دب کر ختم ہو چکیں۔
جاری ہے، اگلی قسط پڑھیں۔

کون سمجھے، کون کرے ؟؟؟ قسط 5

ٹام اینڈ جیری کارٹون اور ان جیسے دوسرے کارٹون تخریبی پروگرام ھیں جو ھماری نسلوں کو ھر وقت کی بے مقصد کی لڑائی کی تربیت دے رھے ھیں اور درحقیقت اسطرح ان کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتیں کو ختم کرنے کی کوشش کی جارھی ھے۔ اس معاملے میں ھم سے اچھے جاپانی نکلے جب انھون نے دیکھا کہ ٹام اینڈ جیری جیسے کارٹوں وں کے ذریعے نسلوں کو خراب کرنے کا سامان کر دیا گیا ھے تو انھوں نے اپنی نسلوں کے تحفظ کیلئے ڈورے مون کارٹون بنا ڈالے۔ ڈورے مون کارٹون بچوں کو لڑائی جھگڑا سکھانے کی بجائے امن و سلامتی، بڑوں کے احترام اور تعمیری سرگرمیوں کا ذھن دیتے ھیں اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ختم کرنے کی بجائے چمکانے کا کام کرتے ھیں۔

جبکہ ٹام اینڈ جیری اور ان جیسے دوسرے کارٹون بچوں کو لڑائی جھگڑے کی طرف راغب کرتے ھیں اور ایسی سوچوں کا عادی بناتے ھیں کہ بچہ اگر پڑھائی کرے بھی تو اس میں کسی قسم کی قابلیت پیدا نہ ھو اور وہ تمام زندگی ھر کسی کے ساتھ بے مقصد لڑائی لڑتا رھے۔ بھولے ذھنوں کی تباھی کیلئے یہ بنیادیں کافی ھیں۔

جیسی بنیاد ویسی عمارت ہو گی۔ مثالیں بہت ہیں ، لیکن چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔
ایک اعلی تعلیم یافتہ بھائی کا اپنی جوان بہن پر ہاتھ اٹھانا معمول ہے۔ ماں کو گالیاں دیتا ہے اور امید یہی ہے کہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی بہن والا سلوک ہی کرے گا۔
ایک گھر میں کارٹون زدہ بچے اعلی تعلیم تو حاصل کر گئے لیکن بیٹوں کے بیویوں کے ساتھ جھگڑے معمول ہیں۔ بیویوں کے علاوہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ عیاشی معمول ہے۔
دفتر کے ملازم بیٹوں کے یعنی اپنے صاحبوں کے خوف سے سہمے رہتے ہیں اور پیٹھ پیچھے دل کھول کر برا کہتے ہیں۔ ان کے والدین ان کے سلوک سے انتہائی تنگ اور لوگوں سے ان کے لئے دعائیں کرواتے پھرتے ہیں۔
ایک اعلی تعلیم یافتہ بیٹی کو بھی طلاق ہو گئی، خاوند کا کہنا تھا کہ اسے بولنے کی تمیز ہی ں میں ہے۔
ایک کھاتے پیتے گھر کا اکلوتا چشم و چراغ سارا دن کمرے میں بیٹھا ایکشن فلمیں دیکھتا اور گیمیں کھیلتا رہتا ہے۔ بات بات پر ماں باپ بیوی کے ساتھ

جھگڑا معمول ھے۔ ماں باپ اپنے بیٹے کی ھر جگہ برائیاں کر کرکے تھک چکے ھیں لیکن جو بویا تھا وہ کاٹنا تو پڑے گا۔ شادی ھو گئی، بچے ھو گئے لیکن معمولات میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔

ایک بچے نے اپنے سے کچھ سال چھوٹے بھائی کی زندگی عذاب بنائی ھوئی ھے۔ اسے بے مقصد مارتا رھتا ھے اور اپنے ماں باپ کو گالی دینا اس کا معمول ھے۔

تعلیم موجود ھے لیکن تربیت نہیں ھو سکی۔

جاری ھے، اگلی قسط پڑھیں۔

کون سمجھے، کون کرے ؟؟؟ قسط 6

صرف چند ھی نہیں، سچ مچ میں کافی والدین دیکھے ھیں جو اسی معاشرے کے لوگ ھیں لیکن انھوں نے انتہائی سمجھداری سے کام لیا ھے۔ ان کے بچے بالکل نارمل بچے ھیں۔ لڑائی جھگڑا نہیں کرتے اور والدین کے انتہائی فرمانبردار اور احترام کرنے والے ھیں۔ میرے پارٹنر کا گھر اور ھمارا ذاتی کاروباری آفس ایک ھی بلڈنگ میں تھا۔ ان کے دو بچوں کا بچپن میں نے بہت قریب سے دیکھا ھے۔ میرا دوست اکلوتا تھا اور ان بچوں کا انکل میں ھی تھا۔ کبھی بھی ان کو لڑتے نہیں دیکھا نہ آپس میں نہ کسی کے ساتھ نہ والدین کے ساتھ۔

ایک صاحب کا بچہ بہت شرارتی ھے، ٹکتا ھی نہیں کوئی نہ کوئی شرارت سوچ کر رکھتا ھے لیکن اس کی شرارتیں بامقصد نظر آتی ھیں۔ حد سے بڑھی ھوئی نہیں ھیں، اوٹ پٹانگ نہیں ھیں۔ اسلئے اس کنٹرول کرنے میں والدین کو پریشانی نہیں ھوتی۔ صاف ظاھر ھوتا ھے بچہ انتہائی ذھین ھے۔

ایک گھر والے مڈل کلاس لوگ ھیں، لیکن والدین انتہائی شریف النفس اور سمجھدار تھے۔ 6 بیٹے 4 بیٹیاں ھیں۔ ان کا تیسرے نمبر کا بیٹا میرا بچپن سے لے کر ابتک کا دوست ھے۔ ان کے گھر میں بیٹے والدین کے اتنے فرمانبردار ھیں کہ حیرت ھوتی ھے اور ان کے بچے ان کی تصویر ھیں۔ انتہائی دھیمے مزاج، پڑھائی میں بہت نمایاں، نمازی، قابل تعریف اور ان کے پیچھے کمال ان کی مائوں کا ھے۔ ان کی بیٹیاں جن گھروں میں گئی ھیں وہ لوگ انتہائی مطمئن ھیں۔ نہ کوئی جھگڑا نہ مسلہ۔ سکون کی زندگی۔ اس گھر کے افراد اور ان کی بہوئیں جن گھروں سے آئیں ھیں، یہ سب بہت قریبی ھیں اور یہ حسن اتفاق ھے کہ ان کا ماحول تقریبا ایک جیسا ھے۔ ٹی وی پر صرف خبریں سنی جاتی ھیں اور بچوں کو ٹی وی سے پرھیز کروایا جاتا ھے۔ گھر میں دینی باتیں معمول ھیں۔

میری خوش قسمتی ھے کہ یہ سب میرے قریبی لوگ ھیں۔ ان سب میں ایک بات مشترک ھے کہ ان بچوں کو 5 سال سے پہلے اسلامی اصول سکھانے کی کوشش کی گئی ھے اور ان کو ٹی وی سے مکمل پرھیز کروایا گیا ھے اور ٹی وی کے ساتھ بچوں کو صرف اچھا دکھنے والے بچوں کے ساتھ دوستی رکھنے کی اجازت گئی۔ اب یہ بچے بڑے ھیں ان کی 5 سال سے پہلے کی تربیت پر جان ماری گئی ھے۔ اب دیکھ کر رشک آتا ھے کہ ان کے والدین بڑے سکون میں ھیں۔ بچے انتہائی تمیز والے ھیں۔ تعلیمی میدان میں کہیں بھی کمزور نہیں ھیں۔ ان کے والدین بس ان کی نگرانی کرتے ھیں

۔ بچوں کی گاڑی درست لائن پر خود ھی چلتی جا رھی ھے۔
سمجھدار والدین کا رویہ، کچھ عجیب قابل تقلید، ملاحظہ کریں۔
میرے دوست کے دو بچے ایک ھی سکول میں پڑھتے تھے، ان کے ایک بیٹے نے اپنی والدہ کو بتایا کہ بھائی نے آج ایک دوسرے طالب علم کا لنچ چوری کر کے کھا لیا ھے، وہ بچہ رو رھا تھا۔ جانتے ھیں کیا ھوا۔ ماں باپ کو مصیبت پڑ گئی۔ بچے کو انتہائی احتیاط اور پیار سے سمجھایا گیا۔ بچے کی ماں نے ساتھ جا کر اس طالب علم سے معافی منگوائی اور اپنے بچے سے اس بچے کو لنچ بھی پیش کروایا اور ٹیچر سے درخواست کی بچے پر کڑی نظر رکھیں کہ آئندہ تو ایسا نہیں کرتا اگر کرے تو سختی کریں اور ھمیں بھی اطلاع کریں تا کہ ھم اسے سمجھا کر اس کی یہ بری حرکت، عادت بننے سے پہلے ختم کروا سکیں۔ ایک سال پہلے یہ فیملی انگلینڈ مستقل سکونت کیلئے کوچ کر گئی تھی لیکن چند دن پہلے ھی واپس آ گئی ھے۔ وجہ انتہائی دلچسپ ھے، ان کا کہنا ھے کہ بچوں کی تربیت ٹھیک سے کرنا ممکن نہیں ھو رھا تھا۔ بچے خراب ھو رھے تھے۔ سو بچوں کی اچھی تربیت کیلئے وطن واپس آ گئے ھیں۔
پاکستان کے بہت مشہور بزنس گروپ کے چیف ایگزٹو اپنی فیملی کے ساتھ آسٹریلیا

شفٹ ہو گئے لیکن کچھ عرصے بعد ھی فیملی اور بچے پاکستان واپس آ گئے۔انھوں نے مجھے
خود بتایا کہ بچوں کی اچھی تربیت اس ماحول میں ممکن نہیں تھی۔
سمجھدار ماں باپ۔ سمجھدار بچے۔ساری عمر کا سکون
جاری ھے،اگلی قسط پڑھیں۔

کون سمجھے، کون کرے ؟؟؟ قسط 7

ٹام اینڈ جیری اور ان جیسے کارٹون ، فلمیں، ڈرامے محض اتفاق نہیں ایک منظم ثقافتی یلغار ھے جسے سمجھنے کی ضرورت ھے اور ھمارے اپنے منفی رویے ایک الگ مصیبت ھیں۔ جب بچے کارٹون دیکھ کے زبردستی کی بنیادی تربیت حاصل کریں گے۔ کمزور اور اوٹ پٹانگ بنیاد کے ساتھ جب یہ سکولوں میں جائیں گے اور پلے گروپ سے کمپیوٹر چلائیں گے اور چند سالوں میں انٹرنیٹ پر چلے جائیں گے اور جیسی سوچ لے کر پروان چڑھے ھیں انٹرنیٹ پر ویسی صحبت رکھیں گے،انٹرنیٹ پر تو اچھا،برا جو چاھو ملتا ھے۔ تو کیسی شخصیت پروان چڑھے گی۔ یہ سوچنے، سمجھنے کی ضرورت ھے اور اس بچے کیلئے منفی سرگرمیاں،ایکشن فلمز دیکھ کر ایک خیالی دنیا میں اپنی ھیروئن کی تلاش میں رھنا آسان ھوگا بہ نسبت اس کہ وہ پڑھائی پر توجہ دے اور زندگی میں ایک بہتر اور تعمیری رویہ اپنا سکے۔ اگر بچوں کی تربیت ان کارٹونوں کے ذریعے ھی ھونی ھے اور آج کی مائوں نے فون سننے اور ڈراموں، فلموں میں اپنے اوقات بتانے ھیں تو جیسے جاپانیوں نے اپنے بچوں کیلئے ڈورے مون جیسے تعمیری کارٹون بنائے تو پھر ھمارے معاشرے کے اچھے اصولوں کے تابع، ھماری اقدار سے ھم آھنگ، تعمیری اور علمی کارٹون ملکی سطح پر بننے چاھئیں جن کو دیکھ کر ھمارے بچوں

کے علم میں اضافہ ہو اور ان کے کردار کی تعمیر ہو سکے۔ موجودہ تخریبی کارٹون تو سازش کا پہلا حصہ ہیں، ہمارے ملک میں ہمارے بچے کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے مرنے تک اس کی بربادی کیلئے ایک منظم ثقافتی یلغار ایک سازش کے تحت جاری رہتی ہے۔

بچے کیلئے اچھے سکول کا انتخاب بھی بہت ضروری ہے اور اچھے سکول کے اچھے ہونے کا معیار، بڑا نام یا زیادہ فیسیں یا بڑا رقبہ نہیں ہے۔ یہ گلی محلے کا سکول بھی ہو سکتا ہے۔ اچھے سکول کا انحصار اس کو چلانے والی شخصیت پر ہے۔

ہمارے ملک کی ایک مشہور اعلی تعلیم یافتہ شخصیت نے ایک دفعہ ایک محفل میں ایک مشہور ادارے کا نام لے کر بتایا کہ میں بچپن میں اس ادارے میں پڑھا ہوں، وہاں کا پڑھا بچہ صرف نام کا مسلمان رہ جاتا ہے، بچے کی اسلام کے خلاف برین واشنگ کر دی جاتی ہے۔

بات ایسی ہی ہے لیکن آج کے دور میں یہ کارٹونوں سے شروع ہوتی ہے، کارٹون ایک بنیاد ہے۔ اگر ہم اپنی آنے والی نسلوں کو ایک بہتر شخصیت دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہر سطح پر اپنی اولادوں کی اچھی تربیت کا بندوبست کرنا ہوگا۔ بچوں کی صحت کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے۔ کچھ دن پہلے خبر آئی کی انڈیا میں میگی نوڈلز میں سیسے کی مقدار تسلی بخش نہیں ہے اور چند دن بعد

گست 2015 کی خبر ھے کہ انڈیا میں میگی نوڈلز پر پابندی لگا دی گئی ھے۔ قابل 13 تقلید بات ھے۔ پنجاب میں خاص طور پر لاھور میں فوڈ ڈیپارٹمنٹ انتہائی محنت سے کام کر رھا ھے، جو قابل تعریف ھے۔ ان کے اختیارات اور افرادی قوت اور کام کرنے کی سہولیات میں اضافہ ھونا چاھئے۔ ان کی تنخواھیں مناسب ھونی چاھئیں اور فوڈ ڈیپارٹمنٹ کو بچوں کی خوراک، خاص طور پر مختلف کمپنیوں کے ڈبے کے دودھ کا کیمیائی تجزیہ کرنا چاھئے اور ان کی ایک سائٹ ھونی چاھئے جہاں عوام الناس ان سے رابطے میں رہ سکیں اور ان کی شائع کردہ رپورٹ پڑھ سکیں۔

ھمارے معاشرے میں اکثر بچوں کو جنک فوڈ اور سوڈا ڈرنک کا عادی بنا کر ان کی صحت کا ستیاناس کر دیا جاتا ھے۔ بچوں کی خوراک کے حوالے سے بھی مائوں کی تربیت بہت ضروری ھے اس مقصد کیلئے حکومتی سطح پر ضروری اقدامات کرنے چاھئیں اور یہ کرنا بہت آسان ھے۔ بچوں کے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ بچوں کو 5/4 گھنٹوں سے زیادہ پیمپر لگانا ان کی صحت کے حوالے سے نقصان دہ ھے۔ اس حوالے سے مائوں کے پاس وقت کی کمی ھے اور بچوں کو بار بار پیشاب پاخانہ کروا کر صاف کرنے کی محنت سے بچنے کیلئے پیمپر کے مناسب استعمال کی بجائے نامناسب استعمال سے بچوں کو جسمانی عوارض میں مبتلا کرنے کا پوری کوشش کی جاتی ھے۔

ننھے منے بچوں کو ماں کی، باپ کی اور اس کے بعد دوسرے متعلقہ لوگوں کی، استاد کی توجہ اور محبت محبت پوری ایمانداری اور سمجھداری سے دینی ہو گی تب ہی ہم ایسے بچے حاصل کر سکیں گے جو بڑے ہو کر ملک و قوم کی بہتری اور ترقی کا باعث بن سکیں۔

جسطرح فیملی پلاننگ اور ڈیسنگی وائرس پر کام کیا جاتا ہے اسی طرح بچوں کی تربیت کیلئے خاص طور پر مائوں کی تربیت کا حکومتی سطح پر خاص اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ میڈیا کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہمارا دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور زندگی کے ہر شعبے اور بچوں کے بارے میں بھی مکمل راہنمائی موجود ہے۔ ہمارا مسلہ یہ ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات اگر پڑھیں بھی تو نماز، روزے، حج سے آگے نہیں جاتے۔ بچوں کے معاملات، کھانا پینا، سونا جاگنا۔ شادی موت، خوشی غمی، کاروبار غرضیکہ ہر ہر کام کے متعلق اسلام مکمل راہنمائی کر رہا ہے۔ بچوں کے معاملے میں بھی میں صرف توجہ کرنے اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اسلام کے دامن کو تھامے رکھا، بچوں کی تربیت خود بخود اچھی ہوتی چلی گئی۔ مسلم معاشرے میں خوشحالی اور امن کا دور دورہ رہا۔ آج بھی ہمیں اپنے ہر معاملے میں اور خصوصا بچوں کے معاملے میں اسلام کے نورانی احکامت پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔۔ لیکن اس کیلئے کوشش کرنی ہو گی، محنت کرنی ہو گی خلوص نیت کے ساتھ، لیکن۔ کون سمجھے، کون کرے۔ ؟

ختم شد.

بزنس میں ترقی اور ملازمین

اگر آپ باس ھیں، پرائیویٹ ملازم ھیں تو کالم ضرور پڑھیں، لیکن اندازے لگا کر، بدگمانی کرکے گناہ کا مرتکب ھونے کی کوشش نہ کریں کیونکہ کالم کا مقصد معاشرے میں رائج غلط رویوں کی نشاندھی کرکے ان کی اصلاح کی کوشش کرنا ھے۔ کسی ادارے یا فرد کی عیب جوئی ھرگز مقصد نہیں ھے، اسلئے حقیقت کو قائم رکھتے ھوئے، غیبت اور عیب جوئی سے بچنے کیلئے کچھ تبدیلی کر دی گئی ھے۔

الف کا ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق تھا، کوشش کرتے کرتے اسے ایک ائیر لائن میں جاب مل گئی۔ ٹکٹنگ اسسٹنٹ سے کام شروع کیا۔ اپنے کام کو محنت اور لگن سے کام کرنے کے علاوہ ایک اور عادت اسے آفیسرز کی نظروں میں لے آئی وہ تھی سر جھکا کر اپنا کام ذمہ داری کے ساتھ کرنا اور آفس میں رنگ رلیوں اور بے قائدگیوں پر آنکھوں کے ساتھ زبان بھی بند رکھنا۔ کریپٹ افسروں کو ایسے ملازمین سے شکایت کا خطرہ نہیں ھوتا اسلئے اپنے خفیہ کام بھی اس کے سپرد کردیئے گئے۔ اسے چھٹی نہیں ملتی تھی کیونکہ کام اس کے اور اس جیسے دوسروں کے سپرد کرکے سینیئرز کو گپ شپ لگانی ھوتی تھی۔ بلڈنگ کے چھت پر جا کر پتنگ بازی کرنی ھوتی تھی۔ اپنی منظور نظر لڑکیوں کے ساتھ کسی کونے کھدرے میں

بیٹھ کر دل لگی کرنی ہوتی تھی۔ چائے کی دعوت میں شرکت کرنی ہوتی تھی۔ اگر باھر کا کوئی ایسا کام کروانا ہوتا جسے ھائی کمان کی نظروں سے خفیہ رکھنا مقصود ہوتا تو اسی کو بھیجا جاتا اور اس دن تو حد ھی ہو گئی جب 102 بخار میں اسے صرف اس وجہ سے چھٹی نہ ملی کیونکہ اگر وہ چھٹی پر جاتا تو سینیئرز اور ان کے منظور نظر چھت پر جا کر بسند کیسے منا سکتے۔ الف محنتی اور شریف ضرور تھا لیکن بیوقوف نہیں تھا۔ اس سب پتہ تھا کہ کون کب ڈیٹ پر جاتا ھے۔ کون مارکیٹنگ کا کہ کر گھر پہنچ جاتا ھے اور یہاں اس کی رپورٹ کوئی دوسرا لکھ دیتا ھے۔ وہ بہت محنتی تھا لیکن اس کا دل کام سے بیزار ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے چھٹی بھی نہیں ملتی، میں کام محنت سے کرتا ہوں لیکن گپیں لگانے والے، آفس کے اندر ھر وقت ڈیٹ پر رھنے والے، سینیئر روعب الگ جماتے ھیں اور اپنے کام الگ کرواتے ھیں اور بیماری کی چھٹی تک نہیں دیتے اور پروموشن کیلئے بھی اپنے چمچوں کا نام بھیج دیا جاتا ھے۔ اس کا دل کام سے اچاٹ ہونے لگا۔ وہ کام کرتا رہا لیکن بجھے دل سے۔ ایک دن اس کے سینیئرز اوپر فون پر ڈیٹ پر تھے اور وہ اکیلا معطل فلائٹ کے مسافروں سے ڈیل کر کر کے تھک گیا، واش روم جانے، پانی پینے تک کی فرصت نہ ملی۔ 9 بجے آفس بند ہونا تھا۔ الف کو شدید غصہ چڑھا اور آج اس نے کچھ عجیب کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے گارڈ کو بتایا، 9 بجے سے کچھ دیر پہلے ھی بنا۔۔ کلو زنگ۔۔ کے گھر چلا گیا اور اگلے دن اپنی ایوننگ شفٹ کے وقت آفس پہنچ گیا۔ ھائی کمان تک بات جا چکی تھی

چنانچہ آتے ھی پہلے اپنے انچارج سے ڈانٹ پڑی اور اسے جی ایم سیلز اینڈ مارکیٹنگ کے پاس جانے کا حکم ملا۔ الف نے اسی لئے تو ایسا کیا تھا۔ دل میں مسکراتا، خوش خوش جی ایم کے پاس حاضر ھو گیا۔ اتنا ذمہ دار سٹاف اور اتنی غیر ذمہ دارنہ حرکت۔ ایسا کیوں کیا آپ نے۔ سر مجبوری تھی، الف نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ کیسی مجبوری؟ سر میں اکیلا تھا۔ واش روم جانا تھا، پانی پینا تھا، 1 ماہ سے ایوننگ شفٹ میں آیا ھوں، ڈیلی کی یہی روٹین ھوتی ھے۔ کل تھک گیا تھا اسلئے چلا گیا۔ آپ کے ساتھ دو بندے اور بھی تھے، آپ کا سینیئر موجود تھا تو ان کو بتا کر جاتے ؟ سر ان کی ڈیوٹی تو اوپر کمپیوٹر سیکشن میں ھوتی ھے میں تو اکیلا ھوتا ھوں۔ بس کبھی کبھی وہ چکر لگا لیتے ھیں۔ کیشیر کی ڈیوٹی بھی کمپیوٹر سیکشن میں لگا دی گئی ھے۔ الف نے بھولا سے منہ بنا کر جب اپنی بات مکمل کی تو جی ایم نے سیلز مینجر کو فون کر کے اسے اور الف کے ساتھ دوسرے کام کرنے والوں اور کیشیر کا فوری اپنے آفس میں آنے کا حکم دیا۔ جیسے ھی وہ اندر داخل ھوئے، ان پر چڑھائی شروع کر دی۔ سیلز کے بندوں کی، کیشیر کی ڈیوٹی کمپیوٹر سیکشن میں کیوں لگائی گئی ھے، یہ لڑکا سیلز کاؤنٹر پر اکیلا کیوں ھوتا ھے ؟ سر سیلز والے تو سیلز ھی میں ھیں کمپیوٹر سیکشن میں ڈیوٹی نہیں لگی اور یہ اکیلا نہیں ھوتا سر۔ سیلز مینجر کی بجھی بجھی سی آواز نکلی۔ جی ایم نے الف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو الف نے اپنی مسکراھٹ کو بڑی مشکل سے چھپایا اور بتایا کہ سر یہ تو اوپر ھی ھوتے ھیں، شروع میں ان کو ایک

دو دفعہ بلانے گیا، گارڈ کو بھی بھیجا، انھوں نے کہا ھم بھی کام کر رھے ھیں، اگر رش ھو تو سنبھال لینا۔ سر رش میں جب بھی آیا تو سر فون پر مصروف ھوتے تھے یا چائے پی رھے ھوتے تو میں کچھ کہے بنا ھو لوٹ گیا، میں نے ڈسٹرب نہیں کیا۔ سر گارڈ سے بھی پوچھ لیں۔ گارڈ نے بھی الف کے بیان کی تصدیق کر دی۔ فون پر ڈیٹنگ اور زیادہ دفعہ چائے پینے کی چوری پکڑی گئی اور اوپر سے نیچے تک سب کی کلاس ھوئی۔ الف کو ڈائریکٹ جی ایم کو رپورٹ کرنے کی ھدایت کر دی گئی۔ الف گھر جا کر بھی ھنستا رھا۔ کچھ عرصے بعد ھی الف کی پروموشن ھو گئی اور اسے ائرپورٹ بھیج دیا گیا۔ الف ائیرپورٹ پہنچ گیا اور اس کی شہرت بھی۔ ائیرپورٹ کے حالات دیکھ کر الف کی سٹی گم ھو گئی۔ اندر، ظاھر کے حالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اندر منظم گروپ کرپشن کی جاتی تھی، شراب شباب کی مستیوں کا دور دورہ تھا۔ وہ الف سے ڈرتے رھتے کہ کہیں الف کے ذریعے ھیڈ آفس میں کوئی شکایت نہ لگ جائے اور الف ان سے ڈرتا رھتا کہ یہ پھنسیں تو وہ بھی کسی جھوٹے چکر میں نہ پھنس جائے۔ کہنے کو ھیڈ آفس کا بڑا سخت ھولڈ تھا۔ سٹیشن مینیجر کا آفس ائیرپورٹ پر ھی تھا۔ لیکن یہ سب اپنے اپنے آفس میں بیٹھ کر اپنے تک آنے والی سب اچھا کی رپورٹس دیکھ کر مطمئن ھو جاتے تھے۔ سٹیشن مینیجر کبھی کبھی باھر نکلتا اور ایک چکر لگا کر اپنے آفس میں بیٹھ کر ٹن ھو جاتا۔ بہت بڑی خامی تھی کہ ھائی کمان کے چیچ نما آفیسرز اور ان کے نچلے سٹاف پر کوئی احتسابی نظام نہیں تھا۔ اوپر سے نیچے سب ایک دوسرے کے

سامنے ننگے تھے، سو ایک دوسرے کا پردہ رکھتے تھے۔ الف جیسے چند لوگ سر جھکا کر مشکل سے گزارا کرتے تھے۔ ھائی کمان تحریری اعداد و شمار کی رپورٹس دیکھ کر مطمئن ھو جاتی اور براہ راست مسافروں کی حالت دیکھنے، ان کے مسائل جاننے کی کبھی کوشش ھی نہ کی گئی۔ مسافر بدظن ھوتے رھے۔ آخر کار یہ ائیر لائن بند ھو گئی اور آج تک بند ھی ھے۔

ایسی کمپنیوں میں پیسوں کا حساب رکھا جاتا ھے۔ ملازمین کو کم سے کم تنخواہ دینے کا باقاعدہ سسٹم بنایا جاتا ھے اور یہ سسٹم بنانے والے ایک دو بڑے افسران کو بڑی تنخواہ، گاڑیوں اور سہولتوں سے نواز دیا جاتا ھے۔ ملازمین سے 12 گھنٹے کام لیا جاتا ھے۔ ملازمین کے اندر بے چینی پھیلتی ھے۔ نتیجتہ وہ منظم کرپشن کرتے ھیں، اگر کرپشن نہ کر سکیں تو وقت اور کام میں ملی بھگت سے ڈنڈی مارتے ھیں جسے پکڑنا بہت مشکل ھے، نتیجتہ کام کا معیار گرتا ھے اور کمپنی کو ایسا نقصان ھوتا ھے جس کا پتہ بہت دیر بعد چلتا ھے۔ اوپر سے نیچے سب ملے ھوتے ھیں۔ آپس میں مخالفت بھی ھو تو انتظامیہ کے سامنے کبھی بھی دوسرے کا راز فاش نہیں ھونے دیتے۔ الف کو بھی یہ بات سمجھ آ گئی تھی۔ لہذا اس نے بھی خاموشی میں عافیت جانی۔ اس کا ائیرپورٹ کے کرتا دھرتا لوگوں سے باقاعدہ ایک معاھدہ ھو گیا تھا۔ دیکھیں سر جو کچھ ھے کبھی بھی میری زبان پر نہیں آئے گا، کوئی جسطرح مرضی پوچھے پھر بھی نہیں آئے گا، لیکن سر میرے ساتھ ڈیوٹی کرنے والوں کو کہ دیں کہ جو مرضی کریں میرے ساتھ آفس میں بیٹھ کر میرے سامنے نہ کریں، باھر جا کر کریں، تاکہ

اگر شکایت لگے بھی تو میرا نام نہ آئے کہ یہ بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ الف کی تسلی کروا دی گئی کہ اسے کوئی خطرہ نہیں، اگر کوئی پھنس بھی جائے تو کچھ دن کیلئے معطل کر کے معافی دلوا دیتے ھیں اور الف کو یہ بھی بتایا گیا کہ ھمارے گھر کے اخراجات، بچوں کے اخراجات بہت ھیں، بہنوں بچوں کی شادیاں بھی کرنی ھوتی ھیں، ھم پی آئی اے کے سٹاف سے زیادہ ڈیوٹی کرتے ھیں لیکن تنخواہ ان کے نصف سے بھی نصف لیتے ھیں۔ ڈیوٹی ٹائم بھی زیادہ ھے، پی آئی اے والوں کو سہولتیں بھی ھیں ھمیں کوئی سہولت نہیں دی جاتی، تو ھم کیا کریں۔ باتیں ساری ٹھیک تھیں اور دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ الف نے اپنی ایمانداری قائم رکھتے ھوئے، سب سے دوستی کر لی۔ الف کی زبان بند رکھنے کا انعام اس کی ساتھ انتہائی اخلاق سے پیش آ کر دیا جاتا اور اوپر کی کمائی کا سارا کاروبار الف کی ڈیوٹی کے دوران آفس سے باھر ھونے لگا۔ کرتا دھرتا کی بات ٹھیک نکلی۔ جب بھی کوئی پکڑا جاتا کچھ دن بعد معافی لے کر دوبارہ ڈیوٹی پر آ جاتا۔ ایک انٹرنیشنل آئی ٹی کمپنی کے سربراہ اکثر ٹریول کیا کرتے تھے انھوں نے ایک دفعہ الف کو بتایا کہ کبھی وہ بھی الف کی کمپنی میں الف کی ھی طرح کام کیا کرتے تھے، انھیں سب پتہ ھے کہ یہاں کیا ھوتا ھے۔ اور میں یہ بھی جانتا ھوں کہ تم کرپشن نہیں کرتے۔ سر میرے ابو سرکاری ملازم ھیں۔ لوگ رشوت لے کر گھر تک بھی آ جاتے ھیں، لیکن میرے ابو رشوت نہیں لیتے اپنا کام ایمانداری سے کرتے ھیں۔ میں بھی اپنا کام محنت سے کرتا ھوں، حلال

کھاتا ھوں، حرام سے بچتا ھوں اور ھمیشہ بچتا رھوں گا۔ الف نے ٹھوک کر جواب دیا۔ آپ چاھو تو میری کمپنی جوائن کر لو، ایمانداری سے کام کرو، ترقی ملتی جائے گی، تنخواہ بھی بڑھتی رھے گی۔ سر کب سے۔ جب چاھو۔ یہ لو کارڈ۔ الف رات تک سوچتا رھا اور اگلے دن بنا کسی کو بتائے آئی ٹی کمپنی کے آفس پہنچ گیا۔ جو کہا گیا تھا اس پر عمل کیا گیا۔ فورا جاب سٹارٹ ھو گئی۔ ایمانداری سے کام کرنے کا مکمل ماحول تھا۔ الف کے گھر والے شروع میں تھوڑا ناراض ھوئے۔ آفس میں فون کر کے انھیں جاب چھوڑنے کے اطلاع دے دی، ایک دن جا کر استعفی دے دیا اور ایک دن جا کر ایکسپیرینس لیٹر لے لیا۔ بے ایمانی اور کرپشن کے ماحول سے نکل کر کام کرنے کا موقع ملا تو الف نے کام میں جان لڑا دی اور پرموشن اور تنخواہ میں اضافہ تو جیسے الف کے غلام بن گئے۔ ایک عام سا آفس ایگزیکٹو بھرتی ھونے والا الف، مائیکروسوفٹ کی نمائندہ کمپنی کے چیف ایگزیکٹو کا پرسنل اسسٹنٹ بن گیا، ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ بھی مل گیا، بنا کسی سفارش کے۔ یہاں پیسے گننے کے ساتھ ساتھ، کمپنی کے ھر ملازم پر پوری نظر رکھی جاتی تھی اور کسٹمرز کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا۔ ایک مکمل سسٹم تھا۔ ملازم کی غلطی، محنت، لاپروائی، لگن سب کا نوٹس لیا جاتا۔ ملازمین کی عزت نفس کا پورا خیال رکھا جاتا۔ ھر ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ھر صورت ادا کر دی

جاتی۔ غلطی پر پہلے اصلاح کی فوری کوشش کی جاتی اور نکالنے کا فیصلہ آخر میں کیا جاتا۔
سب سے اچھی بات تھی کہ اعلی افسران کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے سب ملازمین کی تنخواھیں معقول سے بڑھ کر اچھی تھیں اور معقول سہولتیں بھی مہیا تھیں۔ لمسزا پیسے کمانے کیلئے آنے والے ملازمین اس کمپنی کو اپنی کمپنی سمجھ کر بڑی لگن اور محنت سے کام کرتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آئی ٹی کی فیلڈ میں پنجاب میں یہ کمپنی راج کر رھی تھی اور کمپنی کا چیف ایگزیکٹو جس کا سیاست سے دور دور تک واسطہ نہ تھا، مقتدر حلقے کی آشیر باد سے آئی ٹی منسٹر کا اعزازی عہدہ رکھتا تھا۔

الف کی پہلی کمپنی یعنی ایئر لائن کو صرف پیسے کمانے اور گننے سے غرض تھی، ملازمین کی بہتری اور کسٹمرز کی خدمت کے نام پر صرف خانہ پری کی جاتی۔ ایئر لائن بند ھو گئی۔

الف کی دوسری کمپنی کے عروج کی دو بنیادی وجوہات تھیں۔

1۔۔ ورکرز کے ساتھ پرخلوص، عملی محبت۔ جسکا اظہار تنخواہ اور سہولتوں سے ھوتا تھا۔
2۔ جیسے ھی کوئی کسٹمر کمپنی کے آفس میں قدم رکھتا، اس کی نگہداشت کا ایک علیحدہ سسٹم حرکت میں آ جاتا اور ھمیشہ حرکت میں ھی رھتا۔ کسٹمر خوش ھو کر کمپنی کا چلتا پھرتا کامیاب اشتہار بن جاتا۔ کمپنی کا بزنس بڑھتا گیا۔

یہ کالم بطور مثال کافی ھے۔

ھر کمپنی ترقی کرنے کیلئے مزکورہ بالا 1۔2 دونوں اصولوں کی محتاج ھے۔ ھر کمپنی کا مالک اگر چاھے تو اپنے ملازمین اور کسٹمرز کی بہتری کی بہتر پلاننگ کرکے اپنے کاروبار کی فوری ترقی کر سکتا ھے۔

مشہور ھے عقلمند کیلئے اشارہ ھی کافی ھوتا ھے۔

زلزلے کا پیغام پاکستانیوں کے نام

زلزلے پہلے بھی کئی دفعہ آ چکے ھیں اور معمول یہی دیکھا ھے کہ زلزلہ آیا گھروں سے باھر نکل آئے۔ دل میں خوف پیدا ھوا۔ توبہ کی، کلمہ شریف پڑھا، کچھ دن تک دل میں خوف رھا اور پھر زلزلہ بھی بھول جاتا ھے اور خوف بھی ختم ھو جاتا ھے۔

8 اکتوبر 2005 کو اکتوبر کے مہینے میں زلزلہ آیا اور زلزلے کی شدت ریکٹر سکیل پر 3 ۔7 تھی۔ سرحد، کشمیر کے ساتھ ساتھ پنجاب کا کچھ حصہ بھی متاثر ھوا۔ پورے پورے گائوں، بستیاں اور کئی شہر تہس نہس ھو کر ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ پہاڑ کے پہاڑ، زمین سے اکھڑ کر آبادیوں پر الٹ گئے۔ نہ جانے کتنے ھنستے بولتے زندہ انسان یکایک دفن ھو گئے۔ ایسی ھولناک تباھی مچی کہ ابھی تک اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ھیں۔ امداد لے کر بار بار جانے والے جب بھی واپس آئے تو انھوں نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اپنی آنکھوں سے ھولناک اجتماعی تباھی دیکھ کر آئے ھیں، لیکن مزارات کو سلامت دیکھا بلکہ ھمارے دوستوں کے جو ٹرک امداد لے کر جاتے رھے وہ اکثر مزارات ھی کو اپنا پوائنٹ بنا کر امداد تقسیم کرتے رھے۔ سال 2005 کے زلزلے نے سرحد، کشمیر کے ساتھ پنجاب کا بھی کچھ علاقہ تباہ کر دیا جبکہ باقی ملک محفوظ رھا۔

لیکن حال ھی میں 26 اکتوبر 2015 کو آنے والے زلزلے کے کچھ آثار عجیب ھیں۔ اکتوبر کی مماثلت ھے۔ سال 2005 میں 8 اکتوبر کو زلزلہ آیا تھا اور اس سال بھی اکتوبر کو زلزلہ آیا ھے۔ سال 2005 میں زلزلے کی شدت ریکٹر سکیل پر 3-7 27 تھی، تباھی ھولناک تھی اور اس بار سال 2015 میں زلزلے کی شدت 1-8 بتائی جا رھی ھے، سال 2005 میں زلزلے نے سرحد کشمیر میں بڑی تباھی کے ساتھ، پنجاب کے کچھ حصے میں ھولناک تباھی مچائی، ملک کا باقی حصہ محفوظ رھا۔ اب کی بار زلزلہ سارے پاکستان میں آیا ھے۔ نقصان ھوا ھے، لیکن ملک بہرحال اجتماعی ھولناکی سے ملک بچ گیا ھے۔ لیکن یہ زلزلہ کچھ جگہ تنبیہی تباھی کے ساتھ پاکستان کے چپے چپے پر کچھ پیغام چھوڑ گیا ھے۔ لگتا ھے اب کی بار پاکستانیوں کو کچھ دن زلزلہ زلزلہ کا ورد کرکے زلزلے کو بھول جانے کی بجائے ان پیغاموں کا پڑھنا اور سمجھنا ھوگا۔

زلزلے کا یہ واضح اعلان ھے کہ میں پہلے سے زیادہ شدت سے آیا ھوں لیکن تمہیں اس رعایت دے کر جا رھا ھوں۔ تم سب باز آ جاؤ، باز آ جاؤ۔ ورنہ میں دوبارہ بھی آ سکتا ھوں۔ رشوت خورو، سود خورو، ڈاکے مارنے والو، کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرکے مخلوق کی صحت سے کھیلنے والو، مریضوں کی صحت سے کھیلنے والے ڈاکٹرو، عوام کو اذیت دینے والے جعلی معالجوں، جانوروں، پرندوں کے نام پر

عوام کا پیسہ کھانے والو باز آ جائو۔

اپنے بہن بھائیوں کو جائیدادوں میں وراثتی حق سے محروم کرنے والو، نکاح جیسی مقدس سنت کو ھندو طور طریقوں سے رنگ دینے والو، حق مہر کے اسلامی اصول کو بلیک میلنگ کا ذریعہ بنانے والو، شادی کو کاروبار بنا کر لوگوں کی بیٹیوں کا مزاق بنانے والو، لوگوں کے مال، مکانوں پر ناجائز قبضہ کرنے والو، ماں باپ کی حق تلفی کرنے والو، انھیں بڑھاپے میں اکیلے چھوڑ دینے والو، زنا خورو، شراب پینے والو، بیویوں کے پیچھے لگ کر والدین کے ساتھ زیادتی کرنے والو، اولاد کی حق تلفی کرنے والوں، یتیموں مسکینوں کے ساتھ زیادتی کرنے والو باز آ جائو۔

عوام کے ووٹوں سے منتخب ھو کر عوام کے پیسے سے عیاشی کرنے والے کرپٹ سیاستدانوں، عوام کے ساتھ ناانصافی کرنے والو، مقدمات کا سالہا سال تک انصاف کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والے منصفو، بدمعاشوں کی سرپرستی کرنے والے کرپٹ پولیس افسرو، عوام کے ساتھ ظلم کرنے والے ظالمو، باز آ جائو۔

اسلام اور آئین پاکستان سے ٹکرانے والے میڈیا کے نوسربازو، لوگوں کی غیبتوں سے، ان پر تہمتیں لگانے سے باز آ جائو۔ بے ھودہ لباس پہن کر اسلام سے ٹکرانے

والیوں باز آ جائو۔

پرائیویٹ ملازمین کے نام پر بنے محکموں کے بے ایمان ور کرو، افسرو، کرپشن اور ناانصافیوں سے باز آ جائو، پرائیویٹ ملازمین کا خون چوسنے، ان کے ساتھ زیادتیاں کرنے والے سرمایہ دارو باز آ جائو۔

دینی تحریروں، مقدس تحریروں کا احترام نہ کرکے ان کے گلیوں، نالیوں تک میں جانے کے اسباب بننے والو، اللہ جلا جلالہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے مبارکہ لکھے، آیات مبارکہ لکھے اخباروں کو بے ادبی سے گھما کر لوگوں کر گھروں میں پھینکنے والے اخبار فروشو، اور اس گستاخانہ کام میں ممد و معاون بننے والو باز آ جائو، باز آ جائو۔

اگر تم سب باز نہ آئے تو میں یاد رکھو تمہاری کوئی تدبیر، تمہاری سائنس مجھے آنے سے نہیں روک سکتی، تم خود اپنی بدمعاشیوں سے باز آ جائو ورنہ میں سب کو اس زمین کے اندر غرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ھوں اور میں تم جیسوں ھی کیلئے آتا ھوں۔ میں 26-12- کو انڈونیشیا کے صوبے آچے میں بھی سونامی کے نام سے آیا تھا، 2004 میں جہاں چاھے آ سکتا ھوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ بہتر ھوگا کہ باز آ جائو ،

اگر تم باز نہ آئے، اور مجھے آنا پڑا تو تم برے کام تو درکنار، اچھے کام کرنے کے بھی لائق نہ رھوگے۔ باز آ جاؤ ورنہ تم مٹا دیئے جاؤگے۔ تم کچھ بھی کرنے کیلئے زندہ نہ رھوگے۔ باز آ جاؤ۔ باز آ جاؤ۔

عالم باعمل، امام اھلسنت، حضرت علامہ مولینا الشاہ احمد رضا خان علیہ رحمتہ الرحمٰن فتاوی رضویہ جلد 27 صفحہ 96 تا 97 کے درمیان فرماتے ھیں۔ مفہوم۔ کہ اللہ، تعالی جلا جلالہ نے تمام زمین کو محیط " یعنی گھیرے میں لیا ھوا" ایک پہاڑ پیدا کیا، جس کا کوقاف ھے۔ زمین میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کوقاف کے ریشے پھیلے ھوئے نہ ھوں۔ کوہ قاف بہت بڑا ھے، اتنا بڑا ھے، اتنا بڑا ھے کہ ساری زمین کو گھیرے ھوئے ھے۔ لہذا اس کو کھڑے رھنے کیلئے جگہ بھی بہت ھی بڑی درکار ھے۔ چنانچہ اس کے ریشے بھی حکم الہی جلا جلالہ سے ساری زمین میں پھیلے ھوئے ھیں۔ یہ ریشے کہیں زمین کے اوپر، زمین کے نیچے، یہاں تک کے سمندر کے اندر بھی ھیں۔ جس جگہ زلزلہ بھیجنے کا اللہ جلا جلالہ کا ارادہ ھوتا ھے۔ اللہ جلا جلالہ کوہ قاف کو حکم دیتا ھے۔ کہ وہ اپنے وہاں کے ریشے کو جنبش دے۔ صرف وھیں زلزلہ آئے گا جس جگہ کے ریشے کو حرکت دی گئی۔ ھلکے زلزلے کیلئے ریشے کا ھلکا ھلانے کا حکم ھوتا ھے اور شدید زلزلے کیلئے کوہ قاف کو اپنا ریشہ زور سے ھلانے کا حکم ملتا ھے۔

پارہ 25 سورہ شوری آیت 30 میں ارشاد ھوتا ھے۔ ترجمہ۔ اور تمہیں جو مصیبت پہنچی وہ اس کے سبب سے ھے جو تمہارے ھاتھوں نے کمایا اور بہت کچھ تو معاف فرما دیتا ھے۔

معلوم ھو رھا ھے کہ گناھوں سے مصیبتیں بھی پہنچتی ھیں اور بہت سارے گناہ اللہ تعالی جلا جلالہ محض اپنے فضل و کرم سے معاف بھی فرما دیتا ھے۔ زلزلے کے نتیجے میں دنیا سے جانے والے مسلمانوں میں سے کس کو سزا ملی ھو گی اور کس کو آفت میں مبتلا کر کے گناہ مٹائے گئے ھوں گے، کس کے درجات بلند کئے گئے ھوں گے۔ کس کو سزا ملی اور کون شہید ھوا یہ تو ھم نہیں جانتے۔ لیکن یہ واضح ھے کہ زلزلہ چونکہ اللہ تعالی کی ناراضگی کے سبب آتا ھے اسلئے پاکستان میں رھنے والے مسلمانوں کو بسنت، ویلنٹائن ڈے اور ان جیسے دوسرے بے ھودہ تہوار منانے سے توبہ کر کے یوم توبہ منا کر یہ سیکھنے کی ضرورت ھے کہ انھیں روزانہ توبہ کرتے رھنے کی ضرورت ھے۔ اپنے اعمال پر غور کر کے ان کو درست کرنے کی اسلام کے مطابق کرنے کی ضرورت ھے۔ اگر ایسا کرنے میں سستی ھے، لاپرواھی ھے تو پھر ھو سکتا ھے کہ یہ زلزلہ تو آ کر گزر جائے لیکن بد اعمالیوں کے نتیجہ میں آنے والی قبر و آخرت میں ملنے والی سزائیں ھو سکتا ھے کہ اس زلزلے سے بھی زیادہ بھیانک، ھولناک اور نہ جانے کتنی لمبی ھوں۔ بہتری

اسی میں ھے کہ سب باز آ جائیں اور توبہ کر لیں، روز کریں بار بار کریں۔

سیر اجم کا خدمت بزنس۔ قسط 1

آنکھوں دیکھی بات ھے کہ بے شمار مریض سیر اجم سنٹر جاتے ھیں۔ اللہ کریم کے کرم سے حیران کن بہتری پاتے ھیں اور اپنی شفایابی کی کہانی خوشی سے بار بار سناتے ھیں اور سیر اجم کے دوسرے شہروں میں پھیلے سنٹرز سے بھی ایسی ھی خبریں موصول ھوئی ھیں۔ زندگی سے بیزار، مایوس لوگوں کے چہرے پر ان کی وجہ سے مسکراھٹیں دیکھی ھیں۔ لوگ پریشان آتے ھیں اور یہ ان کو خوش کر دیتے ھیں۔ میں اور میرے احباب بھی ان سے مستفید ھوئے ھیں اور ھمیں بھی ھماری تکلیفوں میں فوری اور حیران کن آرام کا تجربہ ھوا ھے۔ صرف میں نہیں میرے سب احباب بھی حیران تھے کہ آخر کوریا سے اٹھ کر نوبل پرائز حاصل کرکے، پاکستانیوں کی مفت خدمت کیلئے یہ لاکھوں روپے کیوں خرچ کر رھے ھیں۔ آپ ان کے ھیلتھ سنٹر جائیں، روز جائیں، مہینوں جائیں۔ یہ روز آپ کا نہایت خوش اخلاقی سے استقبال کریں گے۔ آپ کو بٹھائیں گے۔ آپ گھنٹوں بیٹھیں یہ آپ کو اپنے طے شدہ پروگرام کے تحت انٹرٹینمنٹ دیں گے یہ آپ کو کسی نفسیاتی معالج کی طرح مسکرانے پر مجبور کر دیں گے۔ نہ پیسے لیتے ھیں نہ کچھ اور ڈیمانڈ کرتے ھیں۔ صرف ایک مطالبہ ھے کہ ھمارے سنٹر آئیں، مفت تھیراپی لیں اور صحتمند ھو جائیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ یہ سب کیوں کرتے ھیں۔ ان کے افسر، ان کے مینیجر، سب کہتے ھیں کہ ھماری کمپنی کا مارکیٹنگ

پلان ھے۔ لیکن ان کی ھاں میں ھاں ملانا احسان فراموشی اور جھوٹ سا لگتا ھے اور میں یہ احسان فراموشی نہیں کر سکتا۔ بزنس اپنی جگہ لیکن آپ صحت کے حوالے سے پاکستانیوں کی جو مفت خدمت کر رھے ھیں۔ خود سے بیزار مریضوں کو پھر سے زندگی کی طرف دھکیل رھے ھیں، یہ چاھے آپ کا مارکیٹنگ پلان ھے لیکن میں اس کو خدمت بزنس ھی کہوں گا۔ پاکستان میں لوگوں کی خدمت کرنے والے ادارے موجود ھیں، بلکہ فلاحی خدمات کے حوالے سے پاکستان کا شہر کراچی دنیا میں پہلے نمبر پر ھے،اور دنیا کی بڑی فلاحی سروس ایدھی فائونڈیشن کا تعلق بھی پاکستان سے ھے۔ لیکن کسی بزنس کمپنی کی ایسی مستقل انسان نوازی پہلی دفعہ دیکھی ھے اور یقینا یہ آپ کی انسان نوازی ھی کا صلہ ھے کہ آپ کی ایک کمپنی سے چھ کمپنیاں بن گئیں۔ سائوتھ کوریا سے شروع ھونے والی سروس دنیا کے 76 ملکوں میں پھیل گئی۔

ھماری ویب" سیرا جم کمپنی کو پاکستان میں خوش آمدید کہتی ھے۔ ھماری ویب" انسان نوازی کے کاموں میں تعاون کیلئے ھمیشہ پیش پیش رھی ھے اور آئندہ بھی رھے گی اور آج ھماری ویب قارئین کو پاکستان میں سب سے پہلے سیرا جم کو میڈیا میں ملکی سطح پر متعارف کروانے کا اعزاز حاصل کر رھی ھے۔ سیرا جم مرحبا۔ پاکستان میں خدمت بزنس کی صحت کے حوالے سے بے مثال کوششوں پر ھماری ویب آپ کا شکریہ ادا کرتی ھے اور آپ کو یقین دلاتی ھے کہ جسطرح آپ نے کورین

سائنسدانوں کی حیران کن دریافت سے پاکستانیوں کی صحت کیلئے مفت سروس کا آغاز کیا ھے،آپ ھماری ویب کو ھر قدم پر اپنے ساتھ پائیں گے۔ ھماری ویب آپ کی یہ خدمات پاکستانیوں کے سامنے پیش کرتی رھے گی۔آپ کی خدمات پاکستانیوں کے دلوں میں ھمیشہ زندہ رھیں گی۔ ھماری ویب خواھش کرتی ھے کہ آپ کی کمپنی مزید ترقی کرے اور آپ انسانیت کی اسی طرح خدمت کرتے رھیں۔

جاری ھے۔

سیراجم کا خدمت بزنس۔ قسط 2

سیراجم کمپنی ایک بڑے بزنس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں لاکھوں روپے خرچ کرکے لوگوں کی مفت خدمت کرکے صحت کی بہتری کی کوشش کرتی ھے، یہ لکھ چکا۔ انسانی، خدمات کا اعتراف بطور پاکستانی میرا فرض تھا لیکن سیراجم میں کام کرنے والے ملازمین کو نظر انداز کرنا میرے نزدیک انسانیت کی توھین کے مترادف ھے۔ لیکن کیا لکھوں، آنکھیں بھیگ رھی ھیں، تقریبا 20 سال بحثیت پرائیویٹ ملازم چار کمپنیوں میں کام کرکے میں پاکستان کے پرائیویٹ ملازمین کے حالات کا بھیدی ھوگیا ھوں۔ پاکستان پرانا نہیں بلکہ ابھی بھی ایک نیا ملک ھے اور آزادی کے مراحل طے کر رھا ھے اور پرائیویٹ ملازمین کے حقوق ملنے میں ابھی کچھ دیر ھے۔ پاکستان کے پرائیویٹ ملازمین، یہ وہ مجبور، مظلوم طبقہ ھے جن کے حقوق حکمرانوں، اپوزیشن، میڈیا، سرمایہ داروں، سب کی نظروں سے ابھی تک اوجھل ھیں۔ چند ھی کمپنیاں ھیں جن کے ملامین آسودہ ھیں، لیکن باقی سب پرائیویٹ ملازمین معاشی دہشت گردی کا مستقل شکار ھیں۔ ان کی مسکراھٹوں کے پیچھے چھپے دکھوں سے میں بخوبی واقف ھوں۔ سیراجم کے سٹاف کو دیکھا، ان کی تعمیری اصلاح کی بہت گنجائش ھے لیکن سیراجم کی مینجمنٹ کے ساتھ ان سب ملازمین کا بھی بہت شکریہ، ھماری ویب کی طرف سے اور ان بے شمار پاکستانی مریضوں کی جانب سے، جنھیں اللہ کریم نے سیراجم کے

ذریعے سے صحت عطا فرمائی ھے۔ سیراجم کے خدمت بزنس کا وجود سیراجم کے سٹاف ھی کی وجہ سے قائم ھے۔" بہت اعلی ،ویل ڈن"۔ مجھے شک نہیں، یقین ھے کہ سوشل سیکورٹی یا اولڈ ایج بینیفٹ کے کارڈ ان کے بھی نہیں بنے ھوں گے،ان کی ڈیوٹی کے اوقات آٹھ گھنٹے سے زیادہ ھی ھوں گے۔ ان کو کمپنی کی طرف سے ٹرانسپورٹ کی کوئی سہولت نہیں ھو گی۔ ھمارے ملک میں پرائیویٹ ملازم کیلئے آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام کرکے بھی اپنی اور اپنے گھر والوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری کرنا ابھی تک مشکل ھے۔ اس سے پہلے کہ پرائیویٹ ملازمین کیلئے میرا درد مجھے کہیں اور لے جائے، میں سیراجم والوں کو یہ واضح کر دوں کہ پرائیویٹ ملازمین کے حالات سے متعلق پریشانیوں کے شکوے پاکستان کے ارباب اختیار سے ھیں،آپ سے بالکل نہیں۔ آپ تو انسان دوست کمپنی ھیں۔ آپ نے پاکستان میں آ کر یہاں کا ماحول دیکھ کر ورکز کی تنخواھیں مقرر کی ھوں گی اور مناسب سمجھ کر کی ھوں گی۔ آپ یہاں کے حالات سے ناواقف ھیں،اسلئے نہ آپ قصوروار نہ آپ سے گلہ۔ آپ کا بزنس میں صحت کے حوالے سے مفت خدمت کا انداز بہرحال قابل تعریف ھے۔ لیکن بس آپ سے اتنا کہنا چاھوں گا۔ پاکستان کا معاشرہ ایک مختلف معاشرہ ھے اور اس کی اپنی روایات ھیں۔ آج کا پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ھے۔ یہاں کے لوگوں کی اھمیت دنیا کو کچھ کم نظر آتی ھے لیکن یہ پاکستان "" آج کی ایٹمی طاقت "" بہت جلد ایک ترقی یافتہ اور طاقتور ملک بن کر دنیا کے سامنے آنے والا ھے اور پاکستانیوں کی اھمیت اور عزت دنیا پر جلد ظاھر ھو گی۔ پاکستان کے

پرائیویٹ ملازمین ملکی ترقی میں بہت بڑے حصے دار ھیں۔ باھر سے آنے والی ھر کمپنی انھیں کی محنت سے اپنا بزنس کرنے کے قابل ھوتی ھے۔ پرائیویٹ ملازمین اپنا اچھا کردار تو ادا کرتے ھیں لیکن صرف چند کے علاوہ باقیوں کو نہ پیار ملتا ھے نہ ان کا حق، ان کو بدلے میں ظلم اور زیادتی کا سامنا کرنا پڑتا ھے۔ میں کئی دن کے بغور مشاھدے کے بعد انتہائی ذمہ داری سے یہ بات کہ سکتا ھوں کہ آپ نے ورکرز کی بہت اچھی ٹیم چنی ھے، آپ کے ھیڈ آفس میں سارا سٹاف اپنی مثال آپ ھے۔ ان کی پریزنٹیشن انسانی صحت کے حوالے سے حیران کن ھوتی ھے اور انتہائی مفید ھوتی ھے، جو بلاشبہ آپ کی تربیت ھے۔ یہ لوگ اپنے اچھے اخلاق اور خدمت سے سیراجم میں آنے والے لوگوں کا دل جیت لیتے ھیں اوران کی یہی محنت آپ کے خدمت بزنس اور کاروبار کی کامیابی کی بنیاد ھے۔ جسطرح آپ انسانی جسم کے پریشر پوائنٹس کو جانتے اور سمجھتے ھیں اور صحت کیلئے انکا استعمال کرتے ھیں۔ اسی طرح آپ کے ورکرز پاکستان کے معاشرے کے پریشر پوائنٹس کو جانتے ھیں اور سمجھتے ھیں کیونکہ یہ اسی معاشرے کی پیداوار ھیں۔ ان پریشر پوائنٹس کو آپ بھی اپنے سٹاف کے ذریعے مثبت طریقے سے ایک جائز مقصد کیلئے استعمال کر سکتے ھیں۔ سیراجم کے ملازمین اپنا کام اچھے طریقے سے کرتے رھیں گے، لیکن اگر آپ ان کی تنخواھیں انٹرنیشنل معیار کے مطابق نہ سہی، کچھ مناسب کر دیں، ان کو زیادہ سہولتیں نہ سہی، ٹرانسپورٹ کی سہولت دے دیں جو ان کا بڑا مسلہ ھے، ان کے اولڈ ایج بینیفٹ کارڈ بنوا دیں، ان کو مذھبی عبادت

کرنے کیلئے روزانہ 10 منٹ کی اجازت دے دیں، تو ان کی بھی خدمت ہو جائے گی اور مریضوں کے ساتھ ان کے بھی دل خوش ہو جائیں گے۔ یہ اپنا کام تو پہلے ہی کر رہے ہیں، یہ لوگ ساتھ میں سیراجم کمپنی کیلئے کرشمے کرکے آپ کو حیران کر دیں گے۔ یہ کرشمے پاکستان کے پرائیویٹ ملازمین کی ایسی خفیہ میراث ہیں جس کا فائدہ اٹھانے کیلئے ان کے دل میں خوشی داخل کرنا ضروری ہے۔آپ ایسا کرکے دیکھیں، آپ کے بزنس کو چار چاند لگ جائیں گے۔

پاکستان کے ھیرو اور فرعون

لکھاری کا کام صرف نشاندھی کرنا، توجہ دلانا ھوتا ھے۔ دو مثالیں پیش ھیں۔ لاھور میں منصورہ کے پاس ایک بنک کی برانچ میں مجھے اکثر جانا پڑتا تھا اور وھاں تقریبا ھمیشہ ایک جیسا ھی ماحول پایا جاتا تھا۔ اندر داخل ھوتے ھی بائیں ھاتھ ایک محفل نظر آتی، جس کے درمیان ایک جوان شمع محفل بن کر لیڈری کر رھا ھوتا۔ سروس کاونٹر پر سسٹم خراب ھے کی گردان روزانہ کا معمول تھی۔ اکثر سٹاف فون پر گپ شپ میں مصروف ھوتا اور ایک جونئیر بندہ سب بندوں کو ڈیل کرتا رھتا، رقم جمع کروا کر رسید لینے کیلئے لمبا انتظار کرنا پڑتا اور کاونٹر سے رقم لینا ایک الگ تکلیف دہ مسئلہ تھا کیونکہ سسٹم خراب رھتا تھا۔ خراب یا بند ائیر کنڈیشنر کی وجہ سے یہ سٹاف خود پنکھوں کے آگے بیٹھا رھتا اور کسٹمرز ایک پنکھے کے آگے پسینے میں نہاتے رھتے۔ نہ جانے اس بنک میں ان حالات کی کیا وجہ تھی۔ مینجر کے کمرے کی طرف نظریں اٹھتی تو جناب اکثر غائب ھی پائے جاتے تھے اور اگر ھوتے تو فون پر مصروف پائے جاتے۔ باقی تفصیل چھوڑ دیتے ھیں۔

لیکن ایک دن ایسا آیا کہ بنک سٹاف میں ایک خاتون آفیسر کا اضافہ ھو گیا اور میں جب بھی بنک جاتا مجھے اتنی حیرت ھوتی کہ میں ان خاتون کے کاموں کے بارے

میں تحقیق کرنے پر مجبور ہو گیا، اس تحقیق کا نتیجہ ملاحظہ کریں۔ میڈم کے سروس کاؤنٹر کے اندرونی جانب نیچے گھسنے اور نظر رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ سٹاف کھانے کھا کر بچا کھچا سالن، روٹی پلیٹوں سمیت وھاں رکھ دیتا تھا اور غالبا زیادہ بدبو آنے پر اٹھایا جاتا تھا۔ میڈم نے نیچے خود گھس کر وہ برتن نکالے، سٹاف اور صفائی کرنے والے کی سرعام بڑی مناسب کلاس لی اور آئندہ وھاں کھانا کھانا منع کر دیا۔ بنک میں داخل ہوتے ھی خوشبو اور ٹھنڈک کا استقبال حیران کرنے لگا۔ کمپیوٹر کی تاروں میں ھاتھ ڈال ڈال کر دیکھنے کی وجہ یہ تھی کہ کمپیوٹر نیٹ ورک کی تاریں چوھے نہ جانے کب سے کاٹ گئے تھے اور سٹاف نیٹ ورک خراب ھے کا سبق پڑھنے میں مصروف رھتا تھا۔ اس خاتون نے سخت نوٹس لیا۔ فوری طور پر نئی وائرنگ کروائی گئی اور کچھ دن میں سسٹم ٹھیک ٹھاک کام کرنے لگے۔ سروس کاؤنٹر کا ایک جونیر بندہ تو کام کرتا ھی تھا، باقی دونوں سینیر بھی اپنے کام چھوڑ کر بنک کے کام کرنے لگے، میڈم اکثر سر پر آ کر کھڑی ھو جاتی اور داخلی دروازے کے اندر والی محفل کا حال تو بڑا عجیب ھوا۔ شمع محفل جوان، لیڈر سے خادم بن گیا، بھاگ بھاگ کر کسٹمرز کے کام کرنے لگا اور باقی لوگ بھی سر جھکا کر کام کرنے لگے۔ البتہ مینجر صاحب اپنی پرانی روٹین ھی میں رھے، ان کی صحت پر نہ پہلے کوئی اثر تھا نہ اب کوئی فرق پڑا۔

دوسری مثال لاھور، اقبال ٹاؤن کے عبدالغفور نار کی ھے۔ اقبال ٹاؤن کی

آبادی کافی تھی لیکن صفر سے ایک مثالی رہائشی علاقے کی منزل ابھی بہت دور تھی۔ٹرانسپورٹ نہیں تھی اس شخص نے بھاگ دوڑ کرکے سرکاری بسوں کا روٹ اقبال ٹاؤن سکیم موڑ تک کروالیا تھا اور اقبال ٹاؤن مین روڈ پر اس شخص نے اپنے ھاتھوں سے 37 نمبر بس کے بورڈ لگائے تھے۔ چوریاں بہت ھوتی تھیں، تھانے کی ضرورت تھی لیکن ابھی محکمے کی طرف سے خاموشی تھی۔ اس شخص نے بھاگ دوڑ کرکے متعلقہ حکام کو مجبور کر دیا کہ تھوڑی آبادی کو بھی پولیس چوکی کی سہولت دے دیں۔ 3 مرلے کے چھوٹے گھروں میں 5 فٹ کی گلی چھوڑنے اور نہ چھوڑنے پر جرمانے سے مڈل کلاس لوگ تنگ تھے۔ عبدالغفور ناز نے چکر لگا لگا کر ڈی جی ایل ڈی اے کو آخرکار قائل کر لیا اور 5 فٹ گلی لازمی چھوڑنے کی پالیسی ختم کر دی گئی۔ اقبال ٹاؤن سکیم بڑی تیزی سے ترقی کرنے لگی اور پرانے غریب لوگ جو سالہا سال سے یہاں کچے گھروں میں مقیم تھے، جن کیلئے ان کے کچے گھر پکے گھروں سے زیادہ قیمتی تھے۔ کسی نئی جگہ جا کر بسنا ان کیلئے ممکن ھی نہ تھا،ان کے سر پر دربدری کا خوف منڈلانے لگا۔ عبدالغفور ناز نے ان کیلئے بے مثال جدوجہد کی اور ایک ایسا وقت آیا کہ یہ شخص کچی آبادیوں کے مکینوں کو لے کر وزیراعلی کے گھر کے باھر دھرنا دے کر بیٹھ گیا اور کامیاب جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچی آبادی کے لوگ جس جس جگہ مقیم تھے ان لوگوں کو اس جگہ کے مالکانہ حقوق دے دئے گئے۔ پوسٹ آفس کی منظوری کروا کر نائٹ پوسٹ آفس کے بھی آرڈر کروا لئے۔ اقبال ٹاؤن ڈونگی گراؤنڈ میں ارد گرد سے بارش کا تمام پانی

اکٹھا ہو کر جوہڑ بن جاتا۔ ارد گرد کے رہائشی گھروں کی بنیادیں کمزور ہونے اور بیماریوں کے خوف سے پریشان رہتے تھے۔ ایک لمبے عرصے کی کوشش کے بعد یہ شخص آخرکار کیس جیت گیا اور گراؤنڈ سے پانی کی نکاسی کیلئے لاکھوں روپے کیلاگت سے مشینری لگا دی گئی اور اس شخص کی محنت سے بارشوں کے دنوں میں جوہڑ بننے والے گراونڈ کو ماڈل پارک کا درجہ دے دیا گیا۔ اس علاقے میں سوئی گیس کی کمی کے مسلے کو حل کروانے کیلئے عبدالغفور ناز کی کامیاب کوششوں پر علاقے کے لوگ ان کے شکر گزار ھیں۔ کارنامے اور بہت لیکن مثال ختم کرتا ھوں۔

مذکورہ بالا مثالوں میں میڈم جن لوگوں سے نبرد و آزما رھی اور عبدالغفور ناز کا جن لوگوں سے پالا پڑا، ان میں سے اچھے لوگوں کو نکال کر جو لوگان سے جھگڑا کرتے رھے، ان کی راہ میں رکاوٹ بنتے رھے، یہ راستے کے روڑا نما لوگ اور ان جیسے لوگ ھمارے چاھے جتنے بھی قریبی ھوں، رشتہ دار ھی کیوں نہ ھوں، یہ ھمارے معاشرے کے فرعون ھیں۔ یہی وہ فرعون ھیں جو اپنے جیسوں سمیت ھمارے معاشرے کی خوشحالی کی راہ میں رکاوٹ ھیں اور ان کی وجہ سے عوام کی تکلیفوں میں خوامخواہ کا اضافہ ھو جاتا ھے۔ ان کی کرپشن، مجرمانہ لاپروائیاں قابل نفرت ھیں۔ ان کے شرمناک کردار سے اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کیجئے۔

اور عبدالغفور ناز اور میڈم اور ان جیسے دوسرے لوگ ھمارے رشتے دار ھوں یا ھمارے کچھ بھی نہ لگتے ھوں ھماری معاشرے کے ھیرو ھیں، جو اپنی سوچ اور اپنے اچھے کردار کے ذریعے چھوٹے چھوٹے فرعونوں سے لڑ کر عوام کیلئے بے شمار آسانیوں اور راحتوں کا سبب بنتے ھیں۔ عبدالغفور ناز کو جرنل ضیا الحق کی طرف سے ملنے والا سپیشل دعوت نامہ میں نے خود پڑھا تھا جس کو اس مجاھد نے نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے ایک دفعہ ان کے ایک کام کی طرف توجہ دلائی کہ یہ کام آپ نے کروایا لیکن بینر دوسرے لوگوں کے نام کے لگے ھیں۔ تو یہ شخص مسکرایا، کہنے لگا کہ میں اپنے نام کیلئے کام نہیں کرتا اور لوگوں سے صلے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ واقعی ایسے لوگ بے لوث ھوتے ھیں۔ آپ لوگ جب بھی ایسے لوگوں سے ملیں تو اپنی بساط کے مطابق کا ساتھ دیں، ان کی تعریف ضرور کریں۔ ھو سکے تو ان کی خدمات کا تحریری شکریہ ان کو پیش کریں۔

ھمارے معاشرے کے فرعونوں کیلئے خاص طور پر غور کا مقام ھے۔ زندگی میں اور موت کے بعد انھیں برے الفاظ ھی میں یاد کیا جاتا ھے۔ انھیں ھیرو بننے کی کوشش کرنی چاھئے۔ فرعونوں کے گروہ سے نکل کر ھیروز کی صف میں آنا مشکل لگتا ضرور ھے لیکن ھے نہیں۔ اگر اپنی سوچوں کو تبدیل کر لیا جائے اور اپنا کام ایمانداری سے کرنے کا عہد کر لیا جائے، انسانوں کی خدمت کا ذھن بنایا جائے تو فرعون سے ھیرو بننے کا سفر چند لمحوں میں طے ھو سکتا ھے۔

مظلوم پرائیویٹ ملازمین قسط 1

کئی بجٹ آئے اور اب پھر بجٹ آ چکا۔ حکومتی پارٹی کے سیاستدان، اپوزیشن کے سیاستدان، میڈیا کے لوگ سب مختلف انداز میں اظہار خیال کر چکے اور کرتے رھیں گے۔

باتیں ھوتی رھیں گی، لیکن بجٹ میں اور بجٹ سے متعلقہ بحثوں اور تحریروں میں پرائیویٹ ملازمین کا نام آپ کو بالکل نظر نہیں آئے گا۔ گورنمنٹ ملازمین کی تنخواھوں، پنشن میں جتنا اضافہ ھوا ھے وہ انھیں مل بھی جائے گا۔ لیکن پرائیویٹ ملازمین کے حقوق کا تو کوئی ذکر ھی نہیں۔ اگر پرائیویٹ ملازمین کا ذکر کریں تو کچھ سوال پیدا ھوتے ھیں۔ گورنمنٹ ملازمین اور پرائیویٹ ملازمین کی تنخواھوں کا موازنہ کیا جائے تو اکثریت پرائیویٹ ملازمین کی تنخواھیں بہت زیادہ کم کیوں ھیں؟ ان کی اور گورنمنٹ ملازمین کی ڈیوٹی کے اوقات یکساں کیوں نہیں ھیں؟ گورنمنٹ ملازمین کو کمی بیشی کے ساتھ میڈیکل کی سہولت اکثر میسر ھے، لیکن اکا دکا پرائیویٹ اداروں کے پرائیویٹ ملازمین کے علاوہ باقیوں کو میڈیکل کی مد میں کیا ملتا ھے اور اگر نہیں تو کیوں نہیں ملتا؟ لیبر حقوق سے متعلقہ ادارے کسی مرض کی دوا ھیں؟ سب پرائیویٹ ملازمین کیلئے پنشن کے قانون پر عمل کیوں نہیں ھوتا؟ چند پرائیویٹ ملازمین کے علاوہ سوشل

سیکورٹی ، اولڈ ایج بینیفٹ کے محکمے والے، پرائیویٹ ملازمین کی اکثریت کے، ہر معاملے میں آنکھیں بند کیوں کئے ہوئے ھیں؟ کیا انھیں آنکھیں بند رکھنے کی تنخواھیں دی جاتی ھیں، اتنے بڑے بڑے دفاتر میں بیٹھ کر یہ آخر کیا کام کرتے ھیں؟ بجٹ میں روپے کم از کم تنخواہ کا اعلان کر کے عوام کا مزاق کیوں کیا اڑایا گیا؟ کیا 14000 روپے میں پارلیمنٹ کا کوئی ممبر اپنا گھر چلا کر دکھا سکتا ھے؟ اور اگر اعلان کر 14000 ھی دیا گیا ھے تو کیا آج کے بعد پاکستانیوں کا کم از کم تنخواہ 14000 روپے ملنا شروع ھو جائے گی؟

کوئی ھے جو اس بات پر روشنی ڈال دے کہ اکثر فیکٹریوں کے اندر گھسنے والے ورکر صبح آٹھ بجے گھستے ھیں تو رات کو آٹھ بجے ھی کیوں فیکٹری کے گیٹ سے باھر نکلتے ھیں، اس کے باوجود ان کو کتنی تنخواہ ملتی ھے؟ سب کے سوشل سیکورٹی کارڈ، اولڈ ایج بینیفٹ کارڈ کیوں نہیں بنتے؟

ھمارے معاشرے میں گنتی کے چند اچھے ادارے ایسے بھی ھیں جہاں ورکر کی عزت ھے، اگر ورکر خوش نہیں تو دکھی بھی نہیں ھے۔ لیکن ان چند اداروں کے علاوہ باقی اداروں پرائیویٹ ملازمین کے ساتھ مختلف طریقے سے حق تلفی کا رواج ایک فرض کی طرح ادا کیا جاتا ھے۔ ان اداروں میں ایک دو بڑے عہدوں پر جو کرتا دھرتا جرنل مینیجر ٹائپ بندے رکھے جاتے ھیں، ان کو بھاری بھر کم

تنخواھوں، منہ مانگی گاڑی اور دوسری سہولتوں سے نوازا جاتا ھے اور ان کا اصل کام یہ ھوتا ھے کہ چند بندوں کو تھوڑی مناسب تنخواہ دے کر باقی تمام خلقت کو ھر ممکن طریقے سے، دبائو کی پالیسی کے تحت، انتہائی کم تنخواہ پر قابو رکھنا، کام کروانا اور اس بات کا خاص اھتمام رکھنا کہ اگر ان میں سے کوئی قانون کے مطابق پوری تنخواہ کی آواز اٹھائے، سوشل سیکورٹی یا اولڈ ایج بینیفٹ کارڈ کی آواز اٹھائے، ورکروں کے حقوق کا مطالبہ کرے تو اس آواز کو اس طرح سے کچل دیا جائے کہ کوئی دوبارہ ایسی جرات کرنے کا سوچے بھی نہیں۔ متعلقہ محکموں کے رشوت خور آفیسروں کو ان کی فیس یعنی رشوت بڑی ایمانداری سے بھجوانا ان کی اولین ذمہ داری ھوتی ھے۔ ٹیکس سے متعلقہ لوگ ان کی خود راھنمائی کرتے ھیں اور یہ لوگ کاغزات کی ھیرا پھیری سے اپنے ادارے کی آمدنی پر جائز ٹیکس صاف بچا کر لے جاتے ھیں۔ آپ ان سے لمبی ڈیوٹی کے اوقات کے بارے میں پوچھیں گے تو یہ کہیں گے کہ جناب ھم اوور ٹائم دیتے ھیں، آپ کو غلط بیانی کا شاھکار ریکارڈ بھی دکھا دیں گے۔ مثلا ھو سکتا ھے کہ آپ کو ریکارڈ دکھایا جائے 100 بندوں کا اور اگر آپ اس کی تفصیل میں جائیں تو پتہ چلے گا کہ لکھا کچھ اور دیا کچھ اور جاتا ھے۔ اور یہ بھی کہ آپ کو 100 ورکرز کا ریکارڈ دکھا کر مطمئن کر دیا جائے گا لیکن اصل ورکروں کی تعداد 1000 یا 1500 ھو سکتی ھے، اور 100 کے علاوہ باقی ورکرز کے ساتھ کمپنی کا سلوک بتانے کے قابل نہیں ھوتا اسلئے اس کو چھپا لیا جاتا ھے۔ 1500 ورکروں والی فیکٹری

سے متعلقہ سرکاری محکموں کے ریکارڈ میں بھی آپ کو ورکرز کی تعداد بہت تھوڑی ھی ملے گی۔ کاغزات کو بڑی ایمانداری کے ساتھ بے ایمانی کرکے ھمیشہ تیار رکھا جاتا ھے، فیکٹریوں میں بھی، متعلقہ محکموں میں بھی اور اس کا خرچہ یعنی رشوت فیکٹریوں والوں کے ھی ذمہ ھوتی ھے۔ بعض اداروں نے ٹیکس بچانے کیلئے سوشل ورک کے نام پر ڈسپنسریاں یا ادارے بنا رکھے ھیں۔ رشوت خور افسروں کی راھنمائی سے بننے والے کاغزات میں سب بہتر اور اچھا جو گورکھ دھندا دکھا کر ٹیکس بچا لیا جاتا ھے۔ اس تمام پروسیس کا نتیجہ ورکروں کے حق میں بہت برا نکلتا ھے۔

پرائیویٹ ملازمین قسط 2

کیا کوئی بتا سکتا ھے کہ گنتی کے چند اداروں کے علاوہ فیکٹریوں، دوکانوں، دفاتر، مارکیٹوں کے متعین گارڈز گرمی ھو یا سردی، طوفان ھو یا بارش، ھر صورت 12 گھنٹے ڈیوٹی کس قانون کے تحت کرتے ھیں؟ ان کی کتنی تنخواہ ھے؟ کوئی یہ بھی بتا دے کہ ان مظلوموں کو گورنمنٹ ملازمین جتنی سہولتیں نہ سہی، سہولت کے نام پر کیا ملتا ھے؟ نچلے اور درمیانے درجے کے ھزاروں ھوٹلوں پر پر کام کرنے والے ورکروں کے حالات کے بارے میں بھی کوئی بتا دے۔ بیکری سے بیکریوں کے نیٹ ورک تک پہنچ جانے والی کمپنیوں کے ورکر کی تنخواھیں کم کیوں ھیں، ان کی ڈیوٹی کے اوقات کیا ھیں؟ دوکانوں پر کام کرنے والے سیلز مین کی زندگی کیسی ھے؟ یہ سب وہ لوگ ھیں جن کی وجہ سے بزنس چل رھے ھیں، جنکی وجہ سے کاروباری حضرات اپنی جیبیں نوٹوں سے بھرتے ھیں۔ لیکن ان مظلوم ورکرز کی جیب ان کی حیثیت اور حق کے مطابق بھی کوئی بھرنے کو تیار نہیں۔ ستم یہ کہ آپ سوشل سیکورٹی، اولڈ ایج بینیفٹ یا لیبر حقوق سے متعلقہ محکوموں میں جائیں تو سب اچھا کی رپورٹ والے جھوٹے کاغزات کا پلندہ آپ کے سامنے رکھ دیا جائے گا، اور کچھ کریں نہ کریں یہ کام ضرور کر لیتے ھیں۔ حکومت، اپوزیشن، میڈیا، یہ سب کی نظروں سے اوجھل ھیں۔ پرائیویٹ ملازمین وہ لوگ ھیں جو ظلم اور جبر کے نظام کی چکی میں روزانہ پس

پس کر اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ھیں۔ کاش کبھی کوئی میڈیا والا ان پرائیویٹ ملازمین پر بھی پروگرام کرے اور دکھائے کہ ان پرائیویٹ ملازمین کی سفید پوشی کے اندر کیسی زندگی چھپی ھے۔ کوئی میڈیا والا اپنے کیمرہ میرے سپرد کرے تو میں پرائیویٹ ملازمین کی سفید پوشی میں چھپے دکھ اور ان کے ساتھ ھونے والی حق تلفیاں آشکار کر دوں۔

میں دنیا کو یہ دکھا سکوں کہ اکثر پرائیویٹ ملازمین کی زندگی اور جانور کی زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ھے۔ لیکن افسوس ھمارے میڈیا کی ذمہ داری میں ایسے مظلوموں کے حقوق کیلئے آواز بلند کرنا نہیں آتا۔

ھم ان کیلئے اور تو کچھ نہیں کر سکتے چلیں ایک دعا ھی سہی۔ ھماری دعا ان مظلوموں کے دل کی آواز ھو گی۔ مظلوم انسان چاھے کسی مذھب سے تعلق رکھتا ھو، وہ کمزور تو ھوتا ھے لیکن اس کی بدعا میں اتنی طاقت ھوتی ھے کہ کوئی ظالم اس بدعا سے بچ نہیں سکتا جلدی یا دیر سے، اسے بدعائوں کا شکار ھونا ھوتا ھے۔ بہت ھو گئی، ان مظلوموں کے حقوق سے آنکھیں بند رکھنے والے ارباب بااختیار اور ان کے ساتھ زیادتی کرنے والے کاروباری حضرات اپنے ظلم کی انتہا پر پہنچ چکے۔

یااللہ جلا جلالہ، اے سب کے مالک و مولی، اے رب کریم جلا جلالہ، پاکستان کو

ایسے حکمران عطا کر دے جو مظلوم پرائیویٹ ملازمین پر ھونے والے مظالم اور زیادتیاں روک دیں۔ جو ان کی تکالیف کا ادراک رکھتے ھوں اور ان کے حقوق ان کا دلا سکیں۔
پرائیویٹ ملازمین کو رشوت خور سرکاری افسروں،ظالم کاروباری حضرات کے مظالم سے نجات عطا فرما دے۔ پرائیویٹ ملازمین کو آسانیاں عطا فرما،ان کو پاکستان میں آسان زندگی نصیب فرما۔ آمین۔